فریبِ خطۂ گل
چار ناویلا
ترنم ریاض
Meer Zaheer Abass Rustmani
امیکس بکس

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

چار ناویلا

ترنّم ریاض

ناشر

FARAEB E KHITTA E GUL

(4 Novellas)

By

TARANNUM RIYAZ

C-11, Jungpura Extn. New Delhi-14

E-mail: tarannumriyaz@gmail.com

Published by: Mir A. Rashid

Computer Editing: Shabir Ahmad(9419705664)

Amacus Books 1 NIT Road Srinagar 190006

Contact No: 01942426457, 0-9906676926

Fax No: 01942423786

E-mail: amicusbooks_mir@yahoomail.com

Branch office: 80 - 085 Ist Avenue Elmhurst New York 11373-4141

Contact No: 007184466472, 007184462914

Fax No: 007184464370

Ist Edition : 2009

نام کتاب	:	فریب خطۂ گل
مصنفہ	:	ترنم ریاض
سرورق	:	میران
تزئین	:	
قیمت	:	=/۳۵۰ روپے
کمپوزنگ	:	نصرت گل نائی
اشاعت	:	۲۰۰۹ء

اللّٰھم انی اخافک و اخاف من لا یخافک

اے اللہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں اور اس سے ڈرتا ہوں جو تجھ سے نہیں ڈرتا۔

(خواجہ حسن بصری)

اڑے ہیں زاغ ہنسوں کے نگر میں
ہوا ہے داغ رو گلزار اپنا

بدران کے لئے

روح سے ٹپکے لہو آنکھ سے پانی برسے
میں نے سوچا ہی نہ تھا، جاتے ہیں بچے گھر سے

فہرست

پیش لفظ

پیش لفظ لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تو ٹیلی ویژن پر دکھائی جانے والی ایک خبر اور ایک پرانی بات یاد آئی۔ ہمارے وہاں ایک رشتے کے بہن بہنوئی کی جوڑی مانی جاتی تھی۔ کوئی بزرگ بی بی کسی نو بیاہتا دولہے کو نصیحت کرتیں تو اس کامیاب جوڑے کی مثال ضرور دیتیں کہ دیکھو تمہارے فلاں بھائی کس خوبصورتی سے دہائی بھر سے رشتہ نبھا رہے ہیں اور دو میں سے کسی نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ شام ڈھلے گھر آجاتے ہیں۔ بچوں کو برابر وقت دیتے ہیں۔ بیوی کی ہر بات کا احترام کرتے ہیں۔ ان کی بیوی ہر وقت مسکراتی، خوش و خرم نظر آتی ہے۔ بچے صحت مند اور گھر کا نظم و نسق قابلِ رشک ہے۔ بی بی یہ بھی کہتیں کہ گھر کے کامیاب ماحول کے لیے اس جوڑے کی تقلید ہی کام آئے گی۔

خاندان بھر کے بچے بڑے ہونے کی عمر تک کامیاب جوڑے کی تعریفیں سنتے رہے تھے، جب کہ خود مجھے رشتے کے ان بھائی صاحب کی تعریف ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بہت پہلے کبھی کبھار چھٹیوں میں آکر سارے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور ساتھ میں غلطی کرنے پر بچوں کے چہروں پر تھپڑ بھی جڑ دیتے تھے۔ خیر چونکہ یہ بات اُن دنوں بڑوں کے لیے عام سی بات تھی، (اور بچوں کے پاس آج کی طرح حقوق اطفال کا کوئی تصور نہیں تھا) اس لیے بچوں کا یہ درد کوئی نہیں جانا کرتا تھا اور وہ رو رو کر چپ ہو جاتے کہ والدین استاد کی مار کو روایتاً رزق دینا، کہا کرتے تھے۔

خاص بات یہ تھی کہ بھائی جان کا تھپڑ مارنے کا طریقہ عام رائج طریقے سے الگ

تھا۔ جس میں مارنے والا ہاتھ لہرا کر ڈھیلی سی انگلیوں سے چپت لگا دیتا ہے اور لکیریں پڑیں تو آڑی پڑتی ہیں۔ بھائی جان اپنے ہاتھ کی اُنگلیاں سیدھی تان کر ہاتھ کو جلدی ہلا کر پہلے گویا نشانہ باندھتے اور ستم زدہ رخسار پر نظریں جما کر عین درمیان میں تھپڑ جڑ دیتے ان کی چار انگلیوں کے درمیان تین متوازی خطوط پھول سے گال پر چھالوں کی طرح ظاہر ہو اُٹھتے۔ سیدھی لکیروں والے یہ زور کے تھپڑ بچوں کے درمیان بھائی جان کی شناخت بن گئے تھے۔ کسی بچے کے چہرے پر یہ نشان دیکھ کر باقی بچے باقاعدہ بھائی جان کے مرنے کی دُعائیں مانگتے۔ اکثر دل ہی دل میں تخلیے میں بہ آوازِ بلند۔

خیر یہ بات پرانی تھی اور بھائی جان اب خاندان بھر میں ایک مثالی شوہر ثابت ہو چکنے کے علاوہ اچھے باپ کے طور بھی جانے جاتے کہ وہ ننھی منھی بیٹیوں پر اُنھوں نے کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا اور بیگم کے لیے تو پھول چھڑی بھی بہت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ اور پھر ہمارے ہم عمر بچے اب بڑے ہو کر ان کے سیدھے سرخ دھاریوں والے تھپڑوں کو بھول چکے تھے۔ ویسے بھی حکم ہے کہ تلخیوں کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے اور نفرتیں درگزر کر دینی چاہییں۔ لیکن اُن دِنوں ایک چھوٹی سی بچی کو پڑھاتے وقت اس کے چہرے پر بھائی جان کا تھپڑ مجھے کبھی نہیں بھولا کیونکہ بھلے ہی بھائی جان نے اُنگلیاں تان کر اس کے نازک سے رُخسار کو ہی نشانہ بنایا تھا مگر ان کی چھنگلیا اس کے کان سے اس زور سے ٹکرا گئی تھی کہ تازہ چھدے اس کے ننھے سے کان کی گلابی سی لو سے چھوٹے سے موتی والا سرخ کن پھول گرا تو اس کے پیچھے ہی خون کا ایک قطرہ بھی ٹپکا تھا۔ جب پھر سیکنڈ بھر میں اس کی آنکھوں میں لبالب آنسوں بھر آئے تھے اور اس نے اپنے چھوٹے سے ہاتھ کی ساری انگلیاں کان کی کچیا پر رکھ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا اور یہ دیکھ کر میرا جی بے تحاشہ بھائی جان کی 'سموسے' ایسی بڑی ناک توڑ مروڑ کر زمین پر پھینکنے کو چاہا تھا۔ بلکہ اُس منظر کے یاد آنے سے اس وقت بھی چاہ رہا ہے۔

خیر سنجیدگی سے سوچا جائے تو یہ ایک اذیت ناک سچائی ہے کہ تشدد کی سب بڑی شکار یہی نازک صنف ہوا کرتی ہے جس کا قصور نہیں ہوتا مگر میں تعصب اور فرقہ پرست قوتوں کی بات نہیں کر رہی۔ میں غیروں کی بات ہی نہیں کر رہی۔ یہ تو اپنوں کا ذکر ہے۔ دوسروں نے جو ستم ڈھائے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں اور خوف و دہشت کی انگنت کہانیاں رقم کیں، وہ سب ایک مسلسل تکلیف دہ عمل کے احساس کی شکل میں اذہان کے لاشعور میں بس چکا ہے۔ میں نے خبروں میں اپنے ہی ہم قوم و ہم زبان، وردی پوش کو ہاتھ میں لمبی سی لکڑی لئے اپنی ہم وطن خواتین پر پے در پے حملے کرتے دیکھا تو آنکھیں بھر آئیں، کہ ان کے پتھر سینوں کے سنگ لاخ دلوں کے اندر اگر رحم نہیں ہے تو خدا کا خوف بھی نہیں؟ بڑی دلدوز شکل ہے طاقت کی ہمارے یہاں۔ کسی بھی تشدد پسند واقعے کی مثالیں پیش کر سکتی ہے۔ قدرت نے اس مضبوط عورت ذات کو جسمانی طور پر کمزور بنایا ہے۔

میں ڈبلیو ڈبلیو ایف کی، سٹیور رائڈر کے ذریعے چھپے نمایاں کرنے والی عورتوں کا ذکر نہیں کر رہی، اس عام عورت کی بات کر رہی ہوں جو ممتا اور محبت کی بنی ہوتی ہے اور زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے جان تو حاضر کرتی ہے مگر آدھی رات کو دوا کی تلاش میں گھر سے باہر نہیں جا سکتی۔ اللہ نے یہ فضیلت مرد کو عطا کی ہے۔

میں اس عورت کی بات کر رہی ہوں جس کا ہتھیار، جس کی اُمید، صرف اس کے آنسوں ہوا کرتے ہیں۔ جنھیں وہ ساری عمر کثرت سے بہاتی رہتی ہے۔

اور اس عورت کی بات کر رہی ہوں جس کا دل ستم سہہ سہہ کر اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ بات بات پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

اور اس عورت کی بات کر رہی ہوں جس کا جگر چُپ چاپ درد برداشت کر کر کے چھلنی ہوتا رہتا ہے اور وہ اُس وقت بھی سوائے رونے کے کچھ نہیں کر پاتی ہے۔

اور یہ بھی ایک صداقت ہے کہ دنیا کا ہر نارمل انسان روتا ضرور ہے اور جب رونے والا ہی بات بخوبی جانتا ہے کہ وہ آنسوؤں کے آنکھوں میں بھرآنے کے عمل کے پیچھے کیا کیا ہوا ہوتا ہے، تو پھر کیوں وہ کسی کو رلاتا ہے کہ یہ آنسو یوں ہی آنکھ میں نہیں آجاتے، روح میں سو برچھیاں اترتی ہیں اور نس نس میں ہزار چھید سے ہوتے ہیں، جب جا کر ایک آنسو چھلکنے کے لیے آنکھ تک پہنچتا ہے۔

خدا معلوم ہمارے مشرقی کلچر میں صدیوں سے رائج انسانیت کے تئیں دوغلے پن پر مبنی یہ رویہ کب ختم ہوگا۔ وادی کا کلچر ہو، وادی کے اطراف کا ہو، یا وادی سے دور دور ریاستوں کا ہو، ہر جگہ یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ عورت ذات اکثر و بیشتر دوسروں کے دلوں کی بھڑاس نکلنے کا آسان ذریعہ بنا کرتی ہے۔ یعنی شوہر اگر بیوی کو بلا سبب ڈانٹ دے تو خود گھر کی بڑی بوڑھیوں کو یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ تم اس کی اپنی ہو وہ تم پر غصہ نہیں اُتارے گا تو کس پر اُتارے گا۔ خالقِ کائنات نے حوا کی بیٹی کی تخلیق غصہ اُتارنے کے لیے نہیں کی تھی بلکہ خلوص بانٹنے کے لیے کی تھی، نسل انسانی کی بقا کے لیے کی تھی، محبت بھرے ساتھ کے لیے کی تھی۔

قاعدے سے شوہروں کی اس لاپرواہ قوم کو باہر کی پریشانیاں گھر کی دہلیز کے باہر ہی چھوڑ دینی چاہیں۔ انھیں غصہ بنا کر گھر کے اندر داخل کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ اپنی شریک حیات سے اگر غم بانٹنا ہی مقصود ہے تو یہ کام بغیر غصہ کیے نہایت خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہوسکتا ہے۔ بلکہ محبت کی بنی اس نازک مخلوق سے خلوص کا رشتہ برتا جائے تو یہ اپنی دور اندیشی اور ذہین مشوروں سے، ایک وقت میں ایک ہی ڈگر پر سوچنے والی اس مرد ذات کے مسئلوں کا اپنی فہمِ عامہ سے دیئے گئے مشوروں کے سبب آسان حل پیش کرسکتی ہے۔ تاریخ نے یہ بات بارہا ثابت کردکھائی ہے کہ مرد کے ہر کامیاب قدم کے پیچھے عورت ذات کا ذہین مشورہ اور مبارک ہاتھ ہوتا ہے۔

خیر! مثالی خانہ دار، رشتے کے بھائی جان کی مسکراتی رہنے والی بیگم کی پیٹھ پر ایک دن میں نے اچانک تین سیدھے متوازی اور سرک آبلہ نما نشان دیکھے تھے، وہ گردن پر دوپٹہ برابر کرتی اس وقت بھی مسکرا رہی تھی۔ لکیریں ڈال دینے والا وہ شدید تھپڑ اگر ذرا اُوپر لگا ہوگا تو گدی پر ضرب پڑھنے سے وہ کچھ دیر کے لیے ضرور بے ہوش ہوئی ہوگی۔ ذرا نیچے لگا ہوگا تو پھیپھڑوں اور دل کے عقب میں جھٹکے سے وہ کتنی ہی دیر تک بے حال اور بے دم ہو کر کھانستی ہوگی۔ اور اگر ذرا زور سے لگ جاتا تو Spinal Cord کے مجروح ہونے کے سبب وہ ہمیشہ کے لیے اپاہج ہوسکتی تھی۔ خبر نہیں کتنے وقت تک کسی دیوار یا پردے کی آڑ میں، کسی کم اندھیرے کمرے کے زیادہ اندھیارے گوشے میں یہ عمل جاری ہوگا۔ اور وہ باہر نکلی ہوگی تو ایسی مسکراہٹ اوڑھ کر جیسی لیونا ڈوڈاونچی نے اپنی شاہ کار تصویر مونالزا کے ذہنوں پر صدیوں پہلے سجائی تھی۔ جسے دیکھ کر کوئی انسان آج تک اپنے ذہن میں اُلجھی ہوئی یہ الجھن سُلجھا ہی نہیں پایا کہ آیا اس مسکراہٹ میں سکون چھپا ہے یا درد پوشیدہ ہے۔ یہ مسکراہٹ غم عیاں کرتی ہے یا خوشی ظاہر کرتی ہے۔ یہ مسکراہٹ بات بیاں کردینے کے بعد کی ہے یا کوئی راز عیاں کردینے سے پہلے کی۔ اس کا سبب صدیوں سے پتہ ہی نہیں چلا۔

غرض یہ کہ مثالی جورے کے بے مثال کامیاب رشتے کا راز بھائی جان کی بیگم کے چپ چاپ ستم سہنے میں پوشیدہ تھا اور کثر کامیاب جوڑوں کے پیچھے اسی طرح کے اسرار ہوا کرتے ہیں۔ (ہے نا برے رنج کی بات؟)

صنفِ نازک پر ستم توڑنے کی ان روایات کے بارے میں سوچتی ہوں تو خالصتاً عورتوں کی ہی طرح ظالموں کو بآوازِ بلند کوسنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سینہ زوری والی نفسیات بدلنے کی فوری ضرورت ہے۔ تشدد کے وقت یہ انا کی ماری مخلوق سوچنا کیوں چھوڑ دیتی ہے۔ جسمانی قوت کے مالک کا اس نازک شے سے کیا مقابلہ۔ اس سے خواہ مخواہ عدم تحفظ کا شکار ہو کر یا اس پر اپنی بہادری کا مظاہرہ کر کے یہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان باتوں

اور لکڑیوں سے مارنے والوں کو خیال بھی نہیں آتا کہ معمولی سی ضرب اس نازک اندام ذی روح کے لیے بڑی سی مصیبت بن سکتی ہے۔ کہ کیا معلوم اس وقت یہ بیٹیاں وقت کی کس جسمانی تبدیلی کے درد سے دوچار ہوں۔ کون جانے یہ بہنیں اپنے اندر ننھی سے کس جان کی امید اُٹھائے ہوئے ہوں اور کسے خبر کہ یہ مائیں امید کے ماہ وسال تمام ہو جانے کے بعد نسوں کے اندر کے کس تکلیف دہ تغیر سے دوچار ہوں۔ جس میں گاہے منفی صفر درجۂ حرارت میں بھی پسینے سے نہا جاتی ہیں اور جس کو جھیلنے سے ان کی ہڈیاں چڑیوں کی طرح ہو جاتی ہیں اور ہلکی سی چوٹ انھیں بستر سے لگا سکتی ہے جہاں سے پھر اُن چار آدمیوں کے کندھوں پر ہی ہوا کرتا ہے۔

کچھ اسی طرح کے معاملے بھی ان ناولیٹس میں ملیں گے۔ اپنی ان چار کہانیوں کو میں اپنی ہم صفیر مخلوقِ اشرف کی نذر کرتی ہوں۔

ترنم ریاض

جنوری ۲۰۰۹ء

مورتی

میں درد جاگتی ہوں زخم زخم سوتی ہوں
نہنگ جس کو نگل جائے ایسا موتی ہوں

کلاسنگم کی پانچ منزلہ عمارت شہر کے عین درمیان بڑی شان سے ایستادہ تھی اور کئی دہائیوں سے فن کے دلدادہ اذہان کے تجسس کی تسکین کا سامان فراہم کر رہی تھی۔ سب سے نچلی منزل کے سامنے بڑا سا باغیچہ تھا جس میں لمبی لمبی قوسیہ سیڑھیاں گھنی ہری گھاس میں چھپی، مخمل سے ڈھکے زینے کی طرح نظر آتی تھیں۔ جب سامنے والے برآمدے کو تماشگاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تو یہ زینہ نشست گاہ کا کام دیتا تھا۔ اُس کے ٹھیک عقب میں داخلی پھاٹک کی بائیں جانب کے مستطیل احاطے کے ایک کونے میں پیپل کے ایک عظیم درخت کے موٹے سے تنے کے پاس لکڑی کی کرسی پر فیصل خاموشی سے بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے پتھر کی میز تھی۔ وہ کبھی مجسموں کو دیکھنے آ رہے تماشائیوں کو دیکھتا اور کبھی اُس کی نظریں قطار میں لگے مجسموں سے اُلجھ جاتیں۔

ٹوٹے ہوئے ایک پنکھ والی فاختہ کے مجسمے کی چونچ ٹوٹ گئی تھی۔ اور آنکھ کی پتلی کی سیاہی غالباً بارش سے دھل گئی تھی۔ اُس کا ہاتھ بے اختیار قمیض کی اوپری جیب کی طرف چلا گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اُس نے وہاں سے ہاتھ ہٹا لیا اور ہتھیلی پر چہرہ ٹکا کر دوسرے مجسمے کو دیکھنے لگا۔

فن شناس ہو...... کسی نے نہایت جاذب آواز میں شاید اُس سے کہا تھا۔ اُس نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا پھر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کا اندرونی حصہ جوڑ کر اپنی ٹھوڑی اُس پر ٹکا دی اور کہیں دور دیکھنے لگا۔

کُرسی کے قریب کی پتھریلی دیوار پر لگے Laminated کاغذ پر ایک حسین لڑکی کی تصویر تھی۔ موتیوں کی دولڑیوں ایسے دانتوں والا مسکراتا چہرہ۔ نازک گردن کے ساتھ گریبان پر آئی ہوئی چوٹی میں گندھے بال کہیں کہیں بکھر گئے تھے۔ سیاہ کُرتے کے نچلے بٹن کے قریب تصویر کے حاشیے کے نیچے انگریزی میں اُس کا نام اور تعارف درج تھا۔

پھر کب مسکرائیں گی آپ۔ فیصل نے ایک طویل سانس لے کر تصویر پر نظریں گاڑ دیں۔

تصویر سے ذرا دُور سامنے کے زاویے سے بنا ہوا بائیں جانب دیکھ رہا چھاتی تک تراشا گیا ایک وجیہہ مرد کا مجسّمہ تھا...... بالکل مجھ جیسا لگ رہا ہے نا...... فیصل مجسّمے کے برابر کھڑا تھا...... نہیں فیصل مجسّمے کے برابر نہیں کھڑا تھا۔ وہ پتّھر کی میز کے قریب بیٹھا ہاتھوں میں چہرہ لیے مجسّمے کو دیکھ رہا تھا۔

مرد کے مجسّمے کا کندھا ٹوٹ چکا تھا اور ٹوٹا ہوا کندھا باقی حصّے کے ساتھ لگا کر رکھا گیا تھا۔ جسم اور شانے کی درمیانی درار واضح تھی۔ اُس کے قریب ایک گملے میں کیکٹس کا پودا تھا جس کی تازہ سیراب کی گئی مٹّی مہک رہی تھی۔ پاس ہی ایک اور مجسّمہ تھا۔ ہرن کے بچے کا۔ اُس نے کان کھڑے کر کے چوکنّے انداز میں اپنی ننھی سی تھوتھنی ذرا سی اوپر اٹھا رکھی تھی۔ اُس کا داہنا کان آدھا ٹوٹا ہوا تھا۔ اُس کے برابر چھوٹا سا ایک لڑکا کُتّے کے ساتھ کھڑا تھا، ان دونوں کا مجسّمہ ایک گول پتّھر پر رکھا تھا۔ کُتّے کی آدھی دم بھی ٹوٹ گئی تھی اور اُسی پتّھر پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے بعد پتّھر کے ایک چوڑے دہانے والے گملے میں لیمو کا چھوٹا سا پیڑ اُگا تھا اور اُس کی بھیگی ہوئی مٹّی سے سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ گملے کے برابر دھونی رمائے سادھو کا مجسّمہ تھا جس کی نیم وا آنکھوں کے اوپر ابروؤں کے عین

درمیان سے پیشانی تک جاتی ہوئی چار آڑھی لکیریں اُبھریں ہوئی تھیں۔فن کی یہ باریکی دیدنی تھی۔سادھو کے سر کے اوپر تراشا گیا جوڑ اٹوٹ چکا تھا اور پدم آسن میں مُڑی ہوئی اُس کی ٹانگوں کے قریب گود میں پڑا تھا۔اوپر پیپل کے درخت کی شاخوں میں چہک رہی چڑیاں میوے کُتر کُتر کر گرا رہی تھیں اور بہت سے ننھے گول گول میوے جوڑا ٹوٹنے سے خالی ہوئی جگہ میں جمع ہو چکے تھے۔برابر میں رقاصہ کا مجسمہ تھا جس کے ہوا میں اُٹھے ہوئے پاؤں کا پنجہ ٹوٹ گیا تھا۔جانے پنجے کا ٹوٹا ہوا حصہ کہاں تھا۔اُس کے قریب زمین میں مدھومالتی کی بیل اُگی تھی جو دیوار کی طرف جھکتی ہوئی پیپل سے لپٹ گئی تھی اور اُس کے سرخ و گلابی پھولوں کی پتیاں نیچے رکھے ماں اور بچّے کے مجسمے پر گری ہوئی تھیں۔بچّے کا مجسمہ جہاں ماں کے مجسمے سے جڑتا تھا وہاں ایک بڑی سی دراز میں سے ڈھلتے سورج کی پیلی روشنی آر پار ہو رہی تھی حالانکہ اُس کے ایک کونے کے نیچے مجسمے کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک اینٹ بھی رکھی گئی تھی۔

فیصل نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اینٹ کو ذرا سا باہر کی طرف سرکایا اور کچھ ٹیڑھا کر کے رکھا مگر دراز جوں کی توں قائم رہی۔

''کیا یہ Transportation میں ٹوٹ گئے ہیں؟'' ایک شخص نے فیصل سے سوال کیا تو فیصل نے اُسے چونک کر دیکھا۔

''......ہاں......کچھ ایسا ہی......ہوا ہے۔'' وہ کچھ پل اُسے دیکھتا رہا پھر باقی لوگوں کو، جو اُسے بات کرتا دیکھ کر اُس کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔

''ایسے......شاہکار......اور......اور یہ لاپرواہی۔'' کھادی کا کُرتا پہنے ایک نوجوان نے دُکھ سے کہا۔

''تقریباً ہر مجسمے کا کوئی نہ کوئی حصہ ٹوٹ......'' اُس نے مزید کہا تو فیصل نے اُنگلی سے کپڑے کے بڑے سے بینر کی طرف اشارہ کیا جو ایک طرف سے پیپل کی ایک شاخ سے

بندھا تھا اور دوسری طرف کی ڈوری آرٹ گیلری کے لمبے سے گول ستون کے ساتھ لپیٹی گئی تھی ۔ اس پر بڑے بڑے حروف میں ایک عبارت درج تھی:

''ٹوٹے ہوئے ستارے''

''اوہ....I am sorry''نوجوان آگے بڑھ گیا۔

''یہ ستم.....کیسے ہوا.....''جینز پہنے ایک لڑکی نے تصویر کھینچی ۔فیصل کچھ نہیں بولا۔

سب مر گئے فیصل......اُس نے ابھی ابھی کسی کو کہتے سنا تھا۔

ایک عمر رسیدہ خاتون پتھر کی میز کے قریب دیوار پر لگی تصویر کے ساتھ لکھی عبارت پڑھ کر مجسّموں کو دوبارہ دیکھ رہی تھی ۔فیصل کو بات کرتے سنا تو قریب آ گئی ۔فیصل کو اُس کی نظروں سے اُس کے سوال کا اندازہ ہو گیا تھا۔

آج نمائش کا پہلا دن تھا ۔صبح سے وہ ایسے سوالات کا کئی بار جواب دے چکا تھا۔اور جھوٹ بولتے ہوئے اور زیادہ رنجیدہ ہو جانے کے ڈر سے وہاں سے ہٹ کر وہ دوسری طرف نکلنے ہی والا تھا کہ صحافیوں کے ایک قافلے نے اُسے گھیر لیا۔

''آ گئیں.....کیا میڈم.....؟''کسی نے پوچھا۔

''جی نہیں.....شاید کہیں مصروف ہو گئی ہیں.....ورنہ اب تک تو.....آ جانا چاہئے تھا اُن کو.....''وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''آئیں گی نا.....اصل میں ہم آج کسی بھی طرح اُنہیں انٹرویو کرنا چاہتے ہیں ۔آپ پلیز ہماری Help کیجئے ۔''دوسرا بولا۔

''جی ہاں.....میں خود بھی انہی کا انتظار کر رہا ہوں.....آئیں گی تو آپ کو Inform کردوں گا.....آپ سب کے کارڈس تو میرے پاس ہیں ہی۔''

''کیا صبح وہ یہاں ہوں گی.....؟''تیسرے نے پوچھا۔

''اُمید تو ہے''فیصل بولا۔''Excuse Me''

وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھا رہے تھے۔ واپس ڈرائیو کرتے ہوئے وہ پتھر کے بُت کی طرح خاموش تھا۔ بارش کے قطرے وِنڈسکرین پر پڑے تو اُس نے وائپر کا بٹن دبا دیا۔

......یہ Pre-monsoons ہیں......کسی نے چپکے سے کہا تھا۔ اُس نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی۔ اور پھر گاڑی سڑک کے کنارے پارک کر کے برستی ہوئی بارش کو نظر بھر کر دیکھا اور آنکھیں موند کر سٹیئرنگ پر سر ٹکا دیا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ اندھیرا گہرا گیا تھا۔ وہ کہیں اور نہ جا کر گھر کے راستے پر ہولیا۔ کئی کئی خیالات نے اُسے گھیر رکھا تھا۔

کیا جواب دے گا وہ کل......اُس نے تو جانے کس کس غم کا مداوا کرنے کی تلاش میں Exibition کی تھی۔ لوگوں کے اتنے سوالات......اُس نے تو یہ سب سوچا بھی نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی طرح وہ ملیحہ کو گھر سے لے آنے میں کامیاب ہو جائے گا اور مجسّموں کی نمائش دیکھ کر وہ......شاید......شاید۔

گھر پہنچ کر بھی وہ سوچوں میں گم رہا۔ یہاں تک کہ رات اُتر آئی۔

اگلی صبح وہ جلد تیار ہونے لگا۔ اُسے نمائش گاہ کے کھلنے سے پہلے وہاں موجود رہنا تھا۔ اور وہ پہلے ملیحہ کے پاس جانا چاہتا تھا......کاش آج وہ اُس کے ساتھ Exibition دیکھنے آ جائے اور مجسّموں کو دیکھ کر شاید......وہ......مگر ٹوٹے ہوئے مجسّموں کو دیکھ کر کہیں......کہیں......

ملیحہ کے پاس پہنچا تو وہ سو رہی تھی......گہری نیند۔

کتنا وقت ضایع کر دیا آپ نے سو کر......جاگ جایئے......کچھ بات کیجئے......

فیصل اُس کی پائنتی کھڑا مسلسل اُسے دیکھتا رہا۔

اور کتنی دیر خاموش رہیں گی آپ...... آواز سننا ہے مجھے آپ کی...... کچھ بولیے نا......

فیصل کی آنکھیں بھر آئیں تو وہ پلٹ آیا۔ یہ...... کیا ہوا جا رہا ہے......

یہ کیوں ہو رہا ہے...... یہ کب تک ہوگا۔ وہ بے چارگی سے سوچنے لگا۔

پہلے تو ایسا نہ تھا۔

''جی میں فیصل بول رہا ہوں۔'' ایک نہایت خوبصورت آواز میں ہیلو کے جواب میں ایک غیر مانوس نام سنائی دیا۔

''معاف کیجئے گا۔ میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔'' وہ نرمی سے بولی۔

''جی میں۔ اصل میں آپ لوگ مجھے جانتے بھی نہیں۔ میں ابھی حال ہی میں دلّی آیا ہوں۔ بڑی مشکلوں سے ڈائریکٹری میں کوئی ایک سو پچاس اکبر علی صاحبان کے رانگ نمبر ملا کر یہ آخری نمبر ملایا ہے۔ جو یقیناً مجھے سب سے پہلے ملانا چاہئے تھا۔'' فون پر ایک دبی دبی مختصری سُریلی ہنسی فیصل کی سماعت کو چھوگئی۔

''مگر میرے خیال میں یہ بھی رانگ نمبر......'' وہ بولی۔

''جی نہیں بالکل نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ میری بات سنئے۔ میں فیصل ہوں ظہیر الدین کا چھوٹا بھائی۔ عافیہ بیگم کا چھوٹا سا دیور......'' وہ بڑے اعتماد سے ہنسا۔ مگر دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔

''دیکھئے محترمہ، میری عافیہ بھابھی اور آپ کی امّی بچپن سے یونیورسٹی تک ساتھ پڑھی ہیں۔ ایک دوسرے کی بڑی گہری دوست رہی ہیں...... شادیاں وادیاں کر کے کوئی بیس ایک برس سے بچھڑ گئی ہیں...... ہم لوگ مسقط میں......''

''اوہ...... اچھا...... کیسے ہیں سب لوگ......؟'' کچھ لمحے خاموش رہ کر وہ خوشدلی سے

بولی۔

''عافیہ بھابھی نے آپ کو Rediscover کرنے کو کہا تھا اور فوراً آپ سب کی خیریت سے انھیں بذریعہ فون آگاہ کرنے کو کہا تھا...... مگر یہاں سب کچھ Set کرنے میں کچھ وقت لگ گیا...... ایک برانچ یہاں بھی کھولنا ہے...... اور میں دن رات......''

''آپ گھر تشریف لائیے...... نا...... جب بھی وقت ملے تو......''

''شام کو حاضر ہوتا ہوں...... چھ کے آس پاس؟...... ٹھیک رہے گا؟''

''بالکل ٹھیک رہے گا۔''

فیصل نے فون رکھا تو مسکرا رہا تھا۔

اُف اتنی پیاری آواز...... الگ سی...... باریک نہ بھاری۔ جیسے دو آوازیں ہوں...... نہیں...... جیسے بات کرتے وقت آواز ایک لمحے کے دسویں، نہیں، بیسویں حصّے میں اچانک مہین ہوکر گھنگھرو کی طرح بج اُٹھے اور پھر...... پہلے کی طرح میٹھی میٹھی سی ہوکر ویسی ہی پُروقار ہوکر...... یعنی کہ...... حد ہے...... ایک آواز تک کی Quality کو میں Describe نہیں کرسکتا...... اور پھر...... اگر آواز یہ ہے تو چہرہ کیا ہوگا...... کتنا بیوقوف ہوگیا ہوں...... ظاہر ہے کہ اپنی ماں جیسا ہی ہوگا۔

اُس نے عجب سی بے چینی سے گھڑی دیکھی اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اُس کے بعد ہلکے سے سر جھٹکا اور ذرا اونچی آواز میں ہنسا...... پاگل ہوگئے فیصل میاں۔ اُس نے اور اُونچی آواز میں کہا اور قمیص اُتار کر غسل خانے میں گھس گیا۔

''ملیحہ دنیا کی سب سے مکمل لڑکی تھی۔ میرے خیال سے......''

عافیہ نے کئی دفعہ گھر میں ذکر کیا تھا۔

''ہر ایک کی ہمدرد...... خوش شکل...... خوش گلو...... خوش لباس اور...... ایک اونچے کردار

کی مالک ...... اور ...... ایک عظیم فن کارہ ...... اُس میں اتنی خوبیاں تھیں کہ میں ہر وقت اُس جیسا بننے کی کوشش کرتی رہتی۔" عافیہ کے چہرے پر دوستانہ خلوص چھلکنے لگتا۔

"مگر مسلسل ناکام ہوتی رہیں۔" ظہیر قہقہہ لگاتا۔ عافیہ ہلکے سے مسکرا دیتی۔

"اچھے کھاتے پیتے گھر کی تھی۔ مگر ایک دولت مند شخص نے پیغام دیا اور فوراً شادی کی شرط رکھی تو اُس کے بھائی اور بھابھی نے رشتہ قبول کرلیا۔"

اُف ...... جب دولہا میں نے دیکھا ...... تو اللہ کی وضع کی ہوئی تقدیر پر ایمان لانا پڑا۔ لڑکا پست قامت۔ اور فربہ بدن بھی۔ گہرا سانولا رنگ، اور آواز بھی لڑکیوں ایسی ...... اونچی ایڑھی والا جوتا۔ ٹخنے تک اونچا، جس کے اندر کی طرف بھی ایڑھی کا کچھ حصّہ ہوتا ہے ...... بیش قیمت لباس اور پارلر سے سیدھا نکل کر آنے والی سج دھج کے علاوہ ولائتی گاڑی بھی اُس میں کہیں سے کوئی جاذبیت پیدا نہ کرسکی تھی۔"

"ہوسکتا ہے اُس میں دوسری خوبیاں ہوں ...... اور پھر ملیحہ میں بھی تو کوئی نہ کوئی خامی رہی ہوگی ...... اللہ نے ہر انسان میں کوئی نہ کوئی ......" فیصل نے پوچھا تھا۔

"ہاں، وہ بہت دولت مند تھا ...... اور ملیحہ میں ...... ایک بہت بڑی خرابی تھی ...... اُسے غصّہ اتنا بے تحاشا آتا کہ ...... بے قابو ہوجاتی۔ خود کو بھی نقصان پہنچاتی اور آس پاس کی چیزوں کو بھی۔ بات کرنا ترک کردیتی۔ کئی کئی دِنوں تک ......"

"او مائی گاڈ ...... اور اُس کے شوہر ......؟"

"بالکل اُس کا ضد۔ یعنی غصّے کے معاملے میں بھی۔ اُس کے دل کی بات ملیحہ کبھی جان نہ پاتی۔ بہت Introvert قسم کا۔ آخری بار میری شادی پر ملاقات ہوئی تھی اُن لوگوں سے۔ میری شادی اس کی شادی کے سال بھر بعد ہی ہوئی تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ لمبے لمبے بالوں والی ایک نہایت حسین لڑکی نے مجھے گود میں اُٹھا رکھا تھا۔ اور بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔" فیصل ہنسا۔

''جی نہیں، جناب کوئی چھ سات برس کے تھے۔ اور ماشاءاللہ خوب صحت مند بھی...... اور وہ نازک سی لڑکی......'' عافیہ بھی ہنسی۔

''ہم مسقط آ گئے...... اور...... وہ...... میں نے فون کیا تو نمبر بدل چکا تھا...... بچھڑ کر ہی رہ جاتی ہیں...... سہیلیاں......'' عافیہ اُداس ہو گئی تھی۔

فیصل آئینے میں بال سنوارتے ہوئے یاد کر رہا تھا۔

پھر بڑی دلرُبا سی خوشبو اُس نے اپنے کانوں کے قریب گردن پر چھڑکی اور دونوں ہاتھوں کو گلے پر پھیر کر خوشبو کی باقی نمی کلائیوں اور ہتھیلیوں پر رگڑ دی اور پھر ہلکے نیلے اور سفید چیک کی قمیض کے ساتھ ہلکی نیلی جینز پہن کر پلنگ کے نیچے سے کل رات لاپرواہی سے پھینکے ہوئے نیلے رنگ کے فلوٹرس نکالنے لگا۔

دو روز پیشتر ہی اُس نے یہ گھر لیا تھا جو ابھی بکھرا بکھرا لگ رہا تھا۔ دراصل یہ ایک فلیٹ تھا اور ایک طرح سے عارضی انتظام۔ کاروبار جماتے ہی وہ وقت نکال کر باقاعدہ بنگلہ خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

جوتے پہن کر اُس نے خود کو ایک بار پھر آئینے میں دیکھا اور نکلنے سے پہلے گیلا تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں پھیلا دیا۔

چھ بجنے میں پانچ منٹ تھے جب وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ ملازم نے اسے ڈرائینگ روم میں بٹھایا۔ کچھ دیر وہ نفاست سے سجے ہوئے کمرے کو دیکھتا رہا۔ شفاف دیوار پر صورۃ الرحمٰن کی آیتوں سے محرک صادقین کی مختلف شبیہات پر بنی آئل پینٹنگ کی کھنچی تصویر سنہرے رنگ کے منقش فریم میں اچھی لگ رہی تھی۔ صوفوں کے سامنے کی لمبی میزوں پر مختلف ملکوں کے نوادرات سلیقے سے سج رہے تھے۔ کونے میں رکھی سیاہ کانچ کی گول میز

پر کرسٹل کی کھلی چونچ والے راج ہنس کی لمبی گردن اور منقار کے درمیان پھنسے نازک سے فریم میں زیورات سے لدی ہوئی ایک لڑکی اپنی لمبی چوٹی گود میں ڈالے، کُرسی پر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے عقب میں ہاتھ میں پائپ تھامے کُرسی کی اونچائی سے ذرا سا اونچا ایک مرد بے تاثر چہرے سے کیمرے کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں کچھ چھوٹے بڑے مجسّمے بھی تھے۔

دروازے کے قریب سر جھکے ایک دوشیزہ کا مجسمہ تھا جو ہاتھ میں لیے پھول کو دیکھ رہی تھی۔ فرش پر رکھے بڑے بڑے گلدانوں میں بغیر چھوئے مصنوعی نہ معلوم ہونے والے خوش رنگ پھول نہایت دلکش لگ رہے تھے۔

ملازم مشروب لے کر اندر داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے ایک لڑکی آئی تو وہ تعظیماً کھڑا ہو گیا اور بیٹھنا جیسے کہ بھول ہی گیا۔

''...... بیٹھیے نا ...... پریشانی تو نہیں ہوئی...... گھر تلاش کرنے میں......''

وہ صوفے پر بڑے باوقار انداز میں بیٹھی گئی۔ اُس کا چہرہ فوٹو والی لڑکی سے بہت ملتا تھا۔ پیازی رنگ کا لباس اُس کی رنگت سے میل کھا رہا تھا۔ گھنے بال، ابرو اور کاجل لگی آنکھیں چہرے پر نمایاں ہو کر بے حد دلکش سی تصویر پیش کر رہے تھے۔

''سب...... خیریت ہے نا...... گھر میں......'' وہ ہلکے سے مسکرائی تو فیصل جیسے چونک کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''جی...... بس ٹیکسی والے نے ذرا زیادہ ہی گول گول گھمالیا۔ ۔ ہاں اُدھر سب اچھے ہیں۔ کل ہی بات ہوئی تھی۔ عافیہ بھابھی بہت یاد کرتی ہیں آپ سب کو...... کتنا Develop ہو گیا ہے یہ شہر...... کہتی تھیں سارا علاقہ ویران ہوا کرتا تھا......''

وہ کمرے کی سیلنگ کے درمیان لگے چھوٹے سے فانوس کی طرف دیکھ کر بولا جس کے ساتھ ستارے کی ساخت کی کانچ کے اندر چھوٹے چھوٹے بلب زنجیروں کے سہارے لٹک رہے تھے جو کھڑکیوں کے شیشوں پر پھیلے پردے کی آڑ سے آرہی ڈوبتے سورج کی

ایک کرن میں پنکھے کی ہوا سے جھول کر چمک جاتے۔

''یہ تصویر بالکل آپ جیسی لگتی ہے۔'' وہ دفعتاً راج ہنس والے فریم میں جڑی تصویر کو دیکھ کر بولا۔

بالکل ماں جیسی حسین ہے...... اُس نے دل میں سوچا تو وہ ایسے مسکرائی جیسے اُس نے اُس کی دل والی بات بھی سُن لی ہو۔

''واقعی......؟'' وہ ہنس دی۔

ہنسنے سے اس کے ہلکی سی لپ سٹک لگے خوبصورت ہونٹ بائیں طرف سے ذرا سا نیچے کو خم ہو گئے۔ اُسی طرف کے نتھنے میں پہنا ہوا ننھا سا لونگ دانتوں کی موتی ایسی قطار کے ساتھ مل کر چمکنے لگا۔ رخسار ذرا سا اوپر کو اُبھرے تو کاجل لگی آنکھیں پپوٹوں کے غلافوں کی اوٹ سے مسکرا اٹھیں۔ ہنسی کی کھنک کشمیری پھرن کے نقرئی گھنگھریوں سے سجے دامن کی صدا جیسی تھی جو ہوا کے جھونکے سے اچانک لہرا گیا ہو۔

فیصل نے ایسی جادو بھری ہنسی پہلے سنی تھی نہ دیکھی تھی۔

''بھابھی کہتی ہیں میری دوست بہت اچھی فن کار ہیں۔'' وہ مجسمے کی طرف دیکھتی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھ کر بولا۔

''یہ سب آپ کو بھی Genes میں ملا ہوگا......''

''Genes میں......؟...... پتہ نہیں......'' وہ مسکرائی۔

''یہ عمر رسیدہ خاتون کا مجسمہ۔ آپ سے مشابہ ہے...... کیسے؟''

''میں نے تراشا تھا...... بہت پہلے کہ بوڑھی ہوں گی تو ایسی نظر آؤں گی...... مگر ہو ہی نہیں رہی......'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''بوڑھی ہوں گی تو کبھی...... ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے...... اور...... وہ...... چھوٹی سی بچی کا...... آپ نے اپنی تصویر دیکھ کر بنایا ہوگا......''

''ہاں...... اپنی بیٹی کا مجسمہ بنایا تھا میں نے...... مگر وہ پیدا نہیں ہوئی...... میں......''

''ارے...... کمال ہے...... کیا Imagination ہے...... تو ہو جائے گی...... ابھی سے کیسے...... بھلا......'' وہ زور سے ہنسا مگر وہ اُسے سنجیدگی سے دیکھتی رہی۔

''چائے...... لیں گے نا۔ آپ؟'' وہ اُٹھ کر چلی گئی تو اُس کی لمبی چوٹی دیر تک فیصل کی آنکھوں میں لہراتی رہی۔

فیصل، ملیحہ کے وہاں سے لوٹا تو ایک مسرّت بھری بے چینی اُس پر طاری رہی۔ اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ کچھ ٹیلی فون۔ کاروبار کے سلسلے میں کچھ لوگوں سے ملاقات۔ گھر کے لیے ملازم کا بندوبست۔ دفتر کی تلاش اور دفتر کا عملہ وغیرہ وغیرہ...... مگر اُس سے کوئی کام نہ ہو پا رہا تھا۔

اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ عافیہ بھابی کی زبانی وہ بچپن سے ہی ملیحہ کی اس قدر تعریف سنتا آیا تھا کہ اُس کا سراپا اُس کے ذہن میں بس گیا تھا۔ عافیہ بھابھی جب پریوں کی کہانی سنایا کرتیں تو تصوّر میں لمبے بالوں کی چوٹی گوندھے ایک پُروقار حسینہ پنکھ لگائے نظر آتی۔ لڑکپن تک آتے آتے لمبی چوٹی والی حسینہ کے پنکھ غائب ہو گئے اور خوابوں میں ایک خوبصورت سراپا رہ گیا جس کا چہرہ واضح نہ ہوتا تھا۔ آج ملیحہ کے وہاں اُسے چہرہ بھی نظر آ گیا تو وہ بے چین ہو اُٹھا۔

اس کا نام...... اُس نے پوچھا ہی نہیں۔ وہ چونکا اور پھر مسکرا دیا۔

اُس نے ٹیکسی بلوائی اور اُسے پرانے شہر کی طرف چلنے کو کہا۔

لمبی لمبی سڑکوں پر بجلی کے کھمبے روشن تھے۔ وہ انھیں پیچھے بھاگتے دیکھتا رہا...... شہرِ دِلّی بھی کسی دل پھینک عاشق کی طرح بدلتا رہا۔ بار بار بسا، بار بار اُجڑا۔ قدیم لغاتِ فیروزی میں دِلّی کی تعریف یوں ہے کہ پنجاب کا ایک شہر جو دریائے جمنا کے کنارے آباد ہے۔

پنجاب کے ٹکڑے ہو گئے۔ جمنا ندی سوکھ گئی...... یہاں...... برسات میں سیراب ہوتی

ہوگی......اور......شہر دلّی اپنی محرومیوں اور ترقیات سمیت نقشۂ ہند پر پورے وقار سے جلوہ افروز ہے۔کتنی تہذیبیں سمٹ آئیں ہیں اس میں......ایک نئی مضبوط Metropolis تہذیب وجود میں آ گئی ہے۔

پھر بھی ویسا ہی خوبصورت ہے جیسا عافیہ بھابھی نے بتایا تھا۔

انڈیا گیٹ کے دائرے میں نصف دائرہ پار کرتے وقت کتنا روشن، رنگیلا اور نشیلا نظر آ رہا تھا شہرِ دلّی۔

میرا حسین......شہر......میرا وطن......فیصل نے زیرِ لب کہا۔

بھابھی نے کہا تھا کہ ملیحہ کے گھر کا علاقہ آدھے سے زیادہ ویران ہے۔سڑک نکل آئی ہے مگر کچّی ہے ابھی......کیونکہ لوگ اکثر اُدھر Farm Houses میں جاتے ہیں Week End گزارنے۔جب ملیحہ کی سسرال والوں نے بنگلہ تعمیر کیا تو راستہ ایک دم اُوبڑ کھابڑ تھا۔ ان ہی دنوں ادھر ایک یونیورسٹی تعمیر ہو رہی تھی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، Late Sixtees میں۔عافیہ بھابھی اور ملیحہ Early Batches میں شامل تھیں۔

شہر کے بڑے تاجروں میں شمار اور عام قد سے کم قامت کے لئے مشہور چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے بھائی اکبر علی کا بنگلے کی تعمیر کے لیے زمین دیکھنے کے سلسلے میں اُس راستے بہت آنا جانا ہوا کرتا تھا۔جبھی انھوں نے ملیحہ کو کہیں دیکھا تھا اور اپنے مخصوص محتاط انداز سے تحقیق کر کے شادی کا پیغام دیا تھا کہ اکبر علی کے تینوں بھائیوں کی بیویاں اوسط درجے کے گھرانوں کی نہایت حسین لڑکیاں تھیں اور اکبر علی کو ملیحہ ان سے بھی حسین معلوم ہوئی تھی ۔اس کے اپنے گھر کے لوگ اور دوست تک نہیں جانتے تھے کہ اُس نے لڑکی کو دیکھا بھی تھا۔یہ بات ملیحہ نے عافیہ بھابھی کو بتائی تھی۔شادی کے مہینوں بعد جب خود اُسے معلوم ہوئی تھی۔

''ایک دن یونیورسٹی کے ایک مجسمہ ساز لڑکے اور ملیحہ کے مجسّموں کی نمائش ہوئی تھی للت کلا اکادمی میں۔ کتنی محنت کی تھی ملیحہ نے لگاتار تین مہینے۔ ہتھوڑی سے چھینی پر ضرب لگالگا کر اُس کی انگلیوں میں چھالے پڑ جاتے تھے، جب جا کر کہیں پتھر کا چھوٹا سا ٹکڑا اپنی جگہ سے سرکتا تھا۔ اس کا داہنا بازو کوئی انچ بھر لمبا ہو گیا تھا۔ دو یا تین گھنٹے سوتی تھی وہ کل ملا کر...... اتنی Dedicated فنکارہ روز روز پیدا نہیں ہوتی......'' عافیہ بھابھی نے لمبی سے آہ بھری تھی۔

''اکادمی میں اب بھی اُس کا وہ مجسمہ محفوظ ہوگا...... میرے خیال سے...... کمر میں گاگر پھنسائے...... پنہارن...... جیسے ابھی ابھی پانی بھر کر کھڑی ہوئی ہو...... مگر...... اکبر علی کو مجسمہ سازی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی...... ملیحہ سے کہتے تھے کہ نہایت سُست رفتار عمل ہے...... گناہ ہے......''

ڈرائیور نے دلّی کی تاریخی جامع مسجد کی طرف گاڑی موڑ دی۔ عافیہ بیگم نے پرانی دِلّی کی اتنی دلچسپ باتیں سنائی تھیں کہ فیصل کو وہاں جانے کا بیحد اشتیاق تھا۔ فیصل کی نظر مغل بادشاہ، شاہ جہاں کی تعمیر کردہ اس عظیم عمارت پر پڑی تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ رات کے دس بج رہے تھے اور رونق ایسی تھی جیسے دن کا وقت ہو۔ اس نے ٹیکسی مسجد کے قریب رکوادی کہ اندر کے بازاروں کی نسبتاً تنگ گلیوں میں رکشے کی سواری زیادہ بہتر تھی۔ عافیہ بھابھی کے زمانے سے بھی پہلے سے قایم کریم ہوٹل کی طرف مڑنے سے پہلے اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کھانا کھانے کے لیے لمبا سا نوٹ دیا تو وہ سلام کر کے مسکرایا۔

''ایئرپورٹ سے رات کی سواری کے بعد تو صاب جی پُرانے شہر کے علاوہ کہیں کھانا نہیں مل سکتا ہم لوگوں کو۔ دِلّی شہر تو پھیلتا جا رہا ہے۔ اُدھر فرید آباد اِدھر غازی آباد اور نہ جانے کیا کیا مگر پرانی دِلّی نہیں بدلی۔'' اُس نے گاڑی مقفّل کرتے ہوئے کہا۔

''میں اِدھر ہی ملوں گا آپ کو جب بھی لوٹیں گے۔''

''ٹھیک ہے......'' وہ بولا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا گلی میں مڑ گیا۔

واقعی پرانی دِلّی نہیں بدلی تھی۔ نئی نئی تعمیرات نے پرانی وضع کے مکانوں میں کچھ تبدیلی پیدا کی تھی مگر بہت کم اور صرف کسی کسی جگہ ہی۔ اور نسل در نسل رہ رہے مکین ابھی تک اپنا وہی طرز زندگی اپنائے ہوئے تھے جو اُن کی دو تین پیڑھیوں سے بھی زیادہ پہلے سے رائج تھا۔ ماسوائے کچھ جدید سہولیات کے، اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ پکوان، ملبوسات، عطر، پان۔ وہی کلچر جیسا فیصل نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ تصویروں میں دیکھا تھا۔ عافیہ بھابی سے سُنا تھا۔

''اب آپ آ گئے ہو صاب جی تو کسی دن فرصت سے آپ کو سارا شہر گھماؤں گا اِدھر کا......'' فیصل لوٹ کر ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔

''میں بہت چھوٹا سا...... چلا گیا تھا...... اپنے وطن سے......'' اپنی تہذیب اور تمدّن کی مقناطیسی کشِش کے زیرِ اثر اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی۔

''چاندنی چوک میں نا...... سو سال سے بھی پہلے کی ایک دُکان ہے...... حلوائی کی...... اصلی گھی میں بنتا ہے وہ جلیبی...... ایک بار کھا لو گے نا...... تو روز کہو گے کہ کرتار بھائی چاندنی چونک چلتے ہیں......'' کرتار سنگھ نے سڑک پر چلی آئی گائے کو دیکھ کر زور کا بریک لگایا۔ ''او تیرا بھلا...... حد ہے''۔ وہ مسکرایا اور لمبا سا ہارن بجا کر رفتار بڑھا دی۔

بریک لگنے سے فیصل نے آگے کو جھٹکا کھایا اور پھر پیچھے نشست کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

اس کی جڑیں تو اس زمین میں پیوست ہیں...... وہ کہاں بھٹکتا رہا...... دیارِ غیر میں...... نہ لوگ اپنے نہ زبان...... نہ مٹی کی یہ خوشبو۔

ملیحہ کے وہاں گزاری ہوئی لطیف شام کے خیالوں پر یہ کون سا جذبہ غالب آ گیا تھا۔ یہ کیسی اپنایت تھی۔ یہ کیسا تحفظ تھا جو نصف شب بھی میسّر تھا۔ یہ راستے جن سے وہ اپنی یادداشت میں کبھی نہیں گزرا...... یہ ٹیکسی والا جس سے وہ کبھی نہیں ملا...... ریاست ہائے متحدہ ہند کی چھوٹی بڑی ریاستوں سے جمہوریۂ ہند کی راجدھانی کی شکل اختیار کرنے والی یہ دِلّی...... یہ مصروف دِلّی...... یہ پُرانی اور نئی دِلّی...... عافیہ بھابی کی دِلّی......اُس کی کتنی اپنی اپنی سی ہے۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور فوراً کھول بھی دیں کہ آنکھیں بند کرنے سے بس ایک سیکنڈ کے کسی حصّے میں اُس نے ٹیکسی کی گہرے نیلے رنگ کی مخمل سے ڈھکی سلینگ پر سنہری رنگ کی نازک گردن سے لگا ایک چہرہ دیکھا تھا جس کی سُبک سی ناک میں پہنی گئی لونگ مسکراتے ہوئے دہانے کے خم کے ٹھیک اوپر جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

اُس نے مسکرا کر ونڈ سکرین کے باہر دیکھا۔ اشوک روڈ کی وسیع سڑکوں پر کھڑے جامن کے پُراسرار درخت بڑے جلال سے ایستادہ تھے۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے کچھ کہا تھا......وہ یاد کرنے لگا۔

''ہاں......کرتار بھائی......کیوں نہیں ضرور......''اُس کے چہرے پر آسودگی چھا گئی اور اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر سر پھر پشت سے ٹیک دیا۔

''دن میں صاحب جی ان درختوں میں بڑے بڑے چمگادڑ آرام کیا کرتے ہیں''۔ کرتار سنگھ ہنسا۔

اگلی صبح وہ عافیہ بھابھی کو فون پر اپنی دریافت کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو''، فیصل کو نازک سی ہیلو دکھائی دے گئی......اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔

''جب تک گھر Set کرلیں۔ یہاں Shift کر لیجیے۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ

خوامخواہ وہاں ...د. قت ہو رہی ہو گی آپ کو۔''

''حاضر ہو جاؤں گا۔ مگر اب ایک طرح سے سمجھئے Set ہو ہی گیا ہوں ...... ورنہ ایسی کوئی تکلّف کی بات ......''

''تکلّف کی باتیں خوب کر لیتے ہیں آپ ویسے......'' وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کب آیئے گا۔''

''جب آپ حکم کریں۔ حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔ فون کر کے ہی آ ؤں گا۔''

''نہیں ...... ایسی کوئی مصروفیت نہیں ہوتی ہے میری۔ کبھی بھی تشریف لے آئیے ...... اپائنٹمنٹ لینے کی کوئی ضرورت نہیں......'' وہ ہنسی۔

''جی۔ بہت بہت شکریہ......'' وہ مسکرایا۔ اُس نے سوچا اُس کا نام پوچھ لے۔ پھر سوچا کہ شاید اچھا نہ لگے ایسے۔ گھر جا کر ہی پوچھنا چاہیے۔

فیصل کا وہ دن بہت مصروفیت میں گزرا...... پورا شوروم ترتیب دینا تھا۔ لکھنؤ کا چکن ورک، علی گڑھ کا پیچ ورک، کشمیر کی ٹیپسٹری، راجستھان کا ٹائی اینڈ ڈائی اور گوٹے کناری کا کام۔ گجرات کی بلاک پرنٹنگ وغیرہ...... یہ سب کتنا اہم ہے آجکل...... کتنا مارکیٹ ویلیو ہے اس سب کا آج کے گلوبل ویلیج میں۔

وہ کاروباری معاملات میں الجھا رہا۔

کبھی تھک کر سر نشست کی پشت سے ٹکا کر سوچوں میں گم ہو جاتا۔

کتنی خوبصورت ہے ملیحہ کی بیٹی۔

کل دن اسٹاف کے ارینجمنٹ میں گزر جائے گا۔ کیا کیا سنبھالا جائے۔ بڑے بھائی! خوب پھنسایا اس ننھی سی جان کو۔

دفتر کے عملے کے بندوبست میں اُسے مزید چار پانچ دن بے حد مصروف رہنا پڑا۔

ہفتے کی شام اُس نے ملیحہ کے گھر فون کیا۔

''ہیلو......'' ایک تھکی تھکی سی زنانہ آواز آئی۔

''جی آداب عرض ہے۔ میں فیصل بول رہا تھا......''

''اوہ...... ہاں آپ کو تو ملنے آنا تھا...... ہم لوگوں سے......''

''جی وہ...... اس قدر مصروف رہا...... شرمندہ ہوں...... آپ ملیحہ صاحبہ بول رہی ہیں نا...... میں نے آپ کی آواز پہچان لی......'' وہ مسکراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''جی...... اچھا...... شکریہ......'' آواز کی تکان قائم تھی۔

''آیئے...... چائے پیتے ہیں...... اکبر بھی آنے والے ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے......''

''حاضر ہوتا ہوں......''

فیصل نے گاڑی خرید لی تھی۔ تیز تیز ڈرائیو کرتے ہوئے وہ آدھ گھنٹے کے اندر ملیحہ کے یہاں وارد ہوا۔ (بعد میں دِلّی ٹریفک پولیس نے گاڑی تیز چلانے (مسقط کی رفتار سے) کے لیے چالان اُس کے گھر بھیج دیا تھا۔)

اخیر مئی کے دن جب وہ ٹھنڈی بند گاڑی سے باہر آیا تو گالوں پر گرم ہوا کے دوبے آواز تھپڑوں نے اس کا استقبال کیا۔ دربان لوہے کے تپتے ہوئے پھاٹک کی چٹخنی لگا کر عجلت سے اپنے چھوٹے سے کیبن میں گھس گیا۔

راہداری طے کرتے ہوئے فیصل نے بادلوں کی زوردار گرج سنی تو چونک کر آسمان کی جانب نظر اُٹھائی...... اوپر آسمان نہیں تھا۔ قرمزی اور سفید بوگن بیلیا کی لمبی لمبی بیلوں نے گیٹ سے بنگلے کے دروازے تک لگی نیلے پلاسٹک کی چادر کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ کچھ پل کو ٹھہر گیا۔ پھر آگے بڑھا۔ برآمدے کے چوڑے مگر محض تین سیڑھیوں پر مشتمل

زینے کے قریب لگے جوٹ کے رنگین دبیز پائدان پر جوتے ہلکے سے رگڑتے ہوئے برابر کی دیوار میں لگے آئینے میں اس نے خود کو ایک نظر دیکھا۔ نیلی چھت سے چھن کر قرمزی سا عکس لاتی ہوئی روشنی میں اس کی پوری آستین کی سفید قمیض کچھ زردی مائل آسمانی نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔ اُس نے انگلیوں سے بال سنوارے اور دونوں آستینوں کے بٹن کھول کر دو دو سلوٹ اوپر لپیٹ لیا۔

جن چند لمحوں میں یہ سب ہوا، انھیں لمحوں میں گیٹ بند ہونے کی آواز سن کر برآمدے کی سیدھ میں دروازے کے اطراف لگی دو کھڑکیوں میں سے ایک کا پردہ ذرا سا سرکا کر کسی نے باہر دیکھا تھا، جہاں ایک خوبرو نوجوان بال سنوار رہا تھا۔ اس کے گریبان اور بازوؤں کے گھنے سیاہ بال اُس کے سر کے تازہ شیمپو کیے ہوئے بالوں جیسے چمکیلے لگ رہے تھے۔ بالوں کی طرف اٹھے ہوئے ہاتھوں کی کسی ہوئی آستینوں میں سے بازوؤں کی مچھلیاں کچھ نمایاں ہو رہی تھیں۔ وہ بھورے رنگ کی پتلون اور اسی رنگ کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ آئینہ دیکھتی ہوئی اس کی آنکھیں بھی ہلکی ہلکی بھوری سی تھیں جو اُس کے بغیر چربی کے رخساروں والے لمبے جبڑوں کے پُرکشش کتابی چہرے کی جاذبیت میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ پردے کی اوٹ سے جھانکنے والی آنکھیں اسے انہماک سے دیکھ رہی تھیں۔ بادل ایک بار اور گرجے تو اس نے چونک کر نظریں ہٹا لیں۔

یہ کیا فضول حرکت کر رہی ہوں میں...... مگر...... اُس روز...... تو جیسے...... میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ خیر...... ہوا کرے...... جیسا بھی ہے...... مجھے کیا لینا دینا۔

بوندیں بوگن بیلیا والی پلاسٹک کی چادر پر شور مچانے لگیں تو اُس نے کھڑکی سے اندر کی طرف پلٹتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ اپنے سر کی تکلیف بھول گئی تھی اور چھوٹی سی گھنٹی بجتے ہی اُس نے دروازہ کھول دیا۔

''آداب......'' وہ اندر آ گیا۔

''بھیگا نہیں...... میں......'' وہ ہنسا۔

''آداب۔ بیٹھئے......'' وہ دھیما سا مسکرائی۔

''ارے...... یہ کیا ہوا......؟'' فیصل نے اُس کے ماتھے پر چھوٹے سے کھرنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''بس یاد مت دلائیے...... اس کی وجہ سے کئی دنوں سے سر میں درد ہو رہا ہے......''

''کئی دن سے......؟ چار پانچ روز پہلے تک تو نہیں تھا۔''

''ہاں نہیں تھا۔ اصل میں مجھے سر میں اتنی چوٹیں لگی ہیں کہ اب بغیر چوٹ کے بھی سر دُکھتا رہتا ہے۔''

''مطلب...... سر میں چوٹ لگانا آپ کا مشغلہ ہے......؟؟''

''ہاں...... کچھ ایسا ہی ہے۔ سر ہے تو...... دُکھے گا ہی...... نا؟'' وہ ہلکے سے مسکرادی۔

باہر بارش تیز ہوگئی۔ ملازم چائے لے کر اندر آیا، ساتھ ہی سوندھی مٹی کی خوشبو بھی دروازے سے داخل ہوئی۔

''باہر...... چلا جائے؟'' وہ بولی تو فیصل نے باہری دروازے کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... ادھر نہیں...... دراصل آپ نے یہ گھر سارا نہیں دیکھا...... نا...... اس کی کچھ باتیں بڑی خوبصورت ہیں...... جیسے اُس طرف کا برآمدہ...... جس میں ہم صبح شام اکثر چائے پیا کرتے ہیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''یہ ہمارے کمرے اور باورچی خانے دونوں سے ملحقہ ہے۔''

''چلئے...... ضرور...... باقی لوگ کہاں ہیں......'' وہ بھی اُٹھا۔

''آنے والے ہوں گے......''

''اور ملیحہ صاحبہ؟...... آج فون پر اُن سے بات ہوئی تھی......'' وہ پیچھے پیچھے چلتا

ہوا بولا۔ وہ برآمدے میں لگی شیشم کی لکڑی کی مُنقش پشت والی جوٹ کی بُنی گئی نشست والی کُرسی پر بیٹھا چاہتی تھی کہ ٹھٹھک کر اُس کی طرف مُڑی۔ اور پھر ایک پل بعد کُرسی پر بیٹھ کر بارش کو دیکھنے لگی۔ جوٹ کی ہی چھوٹی چھوٹی تپائیوں پر ملازم نے ان دونوں کی چائے بنا کر پیالیاں رکھ دیں۔

''یہ...... Pre-monsoons ہیں......'' بارش کو برآمدے کے اوپری زینے پر چھینٹے اڑاتے دیکھ کر وہ بولی۔

''کتنا خوبصورت ہوگیا موسم۔ آن کی آن میں......'' وہ باغیچے کی سبز گھاس کو بھیگتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک اس کی طرف پلٹا۔

''اتنے دن سے...... میں نے آپ کا نام تک نہیں پوچھا...... اور ملیحہ صاحبہ بھی نظر نہیں آ رہیں......'' کچھ دیر پہلے یہ سوال سُن کر وہ چونکی تھی۔ پھر اُسے لگا کہ شاید بوندوں کے شور میں اس نے کچھ غلط سنا ہو۔

''جی......؟؟؟'' حیرت سے اس کا خوبصورت دہانہ ادھ کھلا رہ گیا تو فیصل کی نظر اُس کے دانتوں پر ٹھہر گئی۔ اوپر کے درمیانی دو دانت ایک دوسرے سے ذرا ذرا سے دُور اُس کے اوپری لب کی اوٹ میں سے جھانکتے اُس سے بھی زیادہ حیران نظر آ رہے تھے۔

''آپ کو عافیہ نے...... میرا نام نہیں بتایا کیا......'' اُس کے چہرے پر سے حیرت کے تاثرات کم ہوئے تو ہنستے ہوئے بولی۔

''او...... نو...... میرا مطلب ہے...... آپ...... آپ......؟''

''میں...... میں...... میں کیا؟...... میں آپ کی عافیہ بھابھی کی دوست ملیحہ اکبر علی ہوں......''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے...... میں...... میں تو......''

''کیا نہیں ہوسکتا۔ تم نہیں جانتے ہمیں کیا۔ ہم سب کو؟'' وہ گردن اونچی کیے مسکراتی

ہوئی، کچھ سمجھاتی ہوئی، کچھ حیران سی بولی۔وہ پتھر کے بُت سا حیرت زدہ اُس اٹھی ہوئی نازک گردن کو دیکھتا رہا۔کئی پل ایسے ہی گزر گئے۔ٹھنڈی ہوا ہلکے ہلکے چلتی رہی۔بارش کی بوندیں تھم تھم کر گرتی رہیں۔دُور کہیں کوئل بولنے لگی۔

یکایک اندر سے نہایت سُریلی مغربی دھن سنائی دی۔

''کوئی گٹار بجا رہا ہے کیا.....؟'' وہ اندر کی طرف منہ موڑ کر بولا۔

''نہیں..... یہ گھڑی ہے..... گھنٹہ بجانے سے پہلے گٹار بجا کر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔'' وہ کچھ لمحے رُک کر بولی۔

گھڑی نے سات گھنٹے بجائے۔باہر سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔تین دفعہ..... لمبے لمبے..... تین ہارن۔

''پکوڑے بنالاؤ.....'' وہ برتن سمیٹ رہے ملازم سے مخاطب ہوئی۔

''وہ..... آ گئے.....'' اس نے فیصل کی طرف دیکھا۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا.....'' اُس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

''کس کا..... تمہاری عقل کا.....؟'' وہ خوشدلی سے ہنسی۔

اکبر علی سیدھے برآمدے میں آئے۔اور فیصل سے بشاشت سے ملے۔

''اور بھائی..... ظہیر صاحب کب آ رہے ہیں۔'' انھوں نے ملیحہ کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے کہا۔ملیحہ ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔خود اُس کے چہرے پر سنجیدگی چھا رہی تھی۔

''ملیحہ نے بتایا تھا کہ تم آئے ہو..... بہت دن بعد فرصت ملی.....'' اکبر علی نے فیصل کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔

''آجایا کرو کہ...... ذرا......'' انھوں نے چائے کا گھونٹ نگلا۔ ملیحہ پریشان نظر آنے لگی تھی۔

''کہ ذرا یہ سونا گھر آباد ہو جایا کرے گا...... کچھ انسانوں کی آوازیں سنائی دیں گی...... یہاں تو پتھر ٹوٹنے کی صدائیں آتی ہیں بھائی......''

ملازم آلو اور پالک کی پکوڑیاں طشتری میں لے آیا تھا۔ اکبر علی نے ان پر کالی مرچ اور کالا نمک چھڑک دیا۔ اور ماتھے پر بل ڈالے ایک نظر ملیحہ کو دیکھا اور چائے کی پیالی اٹھالی۔ وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

''چائے اچھی دم کرتا ہے ہمارا غفور......''

انھوں نے ایک اور ویسی ہی نظر ملیحہ کی طرف ڈالی مگر اس وقت ان کا سر جھکا ہوا تھا اور کیتلی فیصل کی طرف سرکائی۔ فیصل ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اکبر علی نے ہونٹ مسکراہٹ کی طرز پر پھیلا رکھے تھے۔ مگر چہرے پر قطعی کوئی تاثر عیاں نہ تھا۔ آنکھ کی پتلی کی جسامت کا نیلم جڑی سفید دھات کی موٹی سی انگوٹھی والی چھوٹی انگلی چائے کی پیالی کا دستہ تھامنے والے مختصر سے ہاتھ کی بقیہ تین انگلیوں سے ذرا دور چمک رہی تھی۔

فیصل ابھی ملیحہ کے انکشاف سے ہی سنبھل نہ پایا تھا کہ اکبر علی کسی سراپا انکشاف کی صورت سامنے آ گئے۔ اور پھر ان کے بے اولاد ہونے کا انکشاف...... اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے وہ اُنہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

اس آدمی کا نام اکبر علی نہیں...... اصغر علی ہونا چاہئے تھا۔ یہ چھوٹا سا سراپا...... اور یہ لمبے لمبے جملے...... کیا زبان عطا کی ہے خدا نے...... اصغر علی...... اُس نے اندر ہی اندر دہرایا تھا۔

پھر چہرے پر چپکے سے چلی آئی مسکراہٹ کو بڑے ضبط سے روک کر اس نے ملیحہ کی طرف دیکھا۔ ملیحہ اس سے نظریں ملتے ہی مسکرانے کو کوشش کرنے لگی، مگر اس کا چہرہ کئی دن کے بخار زدہ مریض کے ایسا لگ رہا تھا۔

رنج کی ایک انجانی سی لہر فیصل کے سینے میں دوڑ گئی۔

وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا...... اور جانے کیا کیا سوچتا ہوا ڈرائیو کرنے لگا۔ بارش سے بھیگی سڑکوں پر کچھ ہلکی رفتار سے گاڑی چلانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

اُس رات اس نے مسقط ٹیلی فون کیا۔

''عافیہ بھابھی...... آپکی سہیلی تو اتنی سمارٹ ہے۔ اور آپ...... اگر میرے آنے تک آپ نے اپنا وزن کم نہ کیا...... تو کبھی نہیں آؤں گا......''

''میں سمجھی نہیں تمھارا مطلب۔'' عافیہ بیگم اس کے جملے پر ہنس دیں۔

''مطلب وطلب کچھ نہیں۔ بس جو میں نے کہا دہی ہوگا...... عافیہ بھابھی...... وہ اصغر علی......'' وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔

''کون اصغر علی......؟'' وہ بولیں۔

''وہ...... وہ...... جو......'' وہ ہنستا گیا۔

''اب بولو گے بھی کہ...... چلو ہنس لو پہلے......'' وہ بھی ہنسیں۔

''میرا مطلب ہے اکبر علی...... کتنا متضاد نام رکھا ہے گھر والوں نے...... وہ تو......''

'' چُپ۔ شریر کہیں کا...... ایسا نہیں کہتے......'' عافیہ بیگم نے پیار سے ڈانٹا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ بیٹی ہے ان کے...... کوئی......؟ دیکھا بھالا خاندان......''

''یہی تو رونا ہے عافیہ بھابھی...... کوئی بیٹی ہی نہیں ان کی......''

''اور بیٹے......؟'' انھوں نے جلدی سے پوچھا۔

''......نہیں...... اُن کے...... کوئی اولاد ہی نہیں......'' اس کی سنجیدہ آواز آئی۔

فیصل نے خود کو کام میں مصروف کر لیا تھا۔ اور مزید مصروف رہنے کے لیے کام کا انتظام کر رہا تھا کہ اسے ارادہ بدلنا پڑا۔ عافیہ بیگم نے کسی کے ہاتھ کچھ سامان بھجوایا تھا جس

میں ملیحہ کے لیے بھی کچھ چیزیں تھیں۔ خوشبو کی کچھ شیشیاں...... شب خوابی کا لباس...... ہرے نیلے گل بوٹوں کی کڈھائی والا سیاہ برقع اور ایک خط۔

فیصل نے فون پر ملاقات کی اجازت چاہی جو بخوشی دے دی گئی۔

ملیحہ کے ماتھے کا زخم بھر گیا تھا۔ مگر بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی پر بینڈ ایڈ چپکا تھا۔ چہرہ بشاش لگ رہا تھا۔

''آج آپ نے انگلی پر غصہ اُتارا......'' وہ مسکرایا۔ ملیحہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کو کس نے کہا...... کہ...... کہ......'' وہ پل بھر کو خاموش ہوگئی۔

''یہ دراصل...... دب گئی تھی مجھ سے...... انجانے میں...... اُس دن البتہ میں نے غصے میں...... ماتھے......'' وہ یکلخت چُپ ہوگئی تو فیصل سوچ میں پڑ گیا۔

ایک...... خرابی ہے ملیحہ میں...... اُسے غصہ بے تحاشا آتا ہے...... اپنے آپ کو بھی تکلیف پہنچاتی ہے اور......

''اب آپ نے غصہ صرف خود پر اُتارنا شروع کردیا ہے......''

وہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ نظریں جھکائے اپنی انگلی کو دیکھتی رہی۔ پھر فیصل کی طرف دیکھنے لگی۔

''اب...... اور کسی پر نہیں اتارتی میں غصہ...... عافیہ سے کہہ دینا۔''

اُس نے اداسی سے کہا...... مگر اگلے ہی پل اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''جانتے ہو...... میں ایک Sculpture بنا رہی ہوں......'' وہ بچوں کی طرح چہکی۔

''اوہ تو کیا...... انھوں نے...... اکبر بھائی نے اجازت......؟''

''انھوں نے بہت پہلے کہہ دیا تھا...... کہ کبھی کبھار ٹھیک ہے مگر اس شرط پر کہ Exhibition نہ کی جائے...... تم دیکھوگے......؟'' وہ فیصل کے چہرے کی طرف دیکھتی

رہی۔ فیصل نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں دو جہاں کی خوشی سمٹ آئی تھی۔

''بالکل......'' وہ جگمگ کرتی آنکھوں کو پل بھر دیکھا کیا اور پھر دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی کھڑی ہوگئی اور اس کے آگے آگے چلنے لگی۔

''Basement میں ہے میرا Studio۔'' وہ زینہ اُترتے ہوئے بولی۔

تہہ خانے میں جہاں کئی نیم فضول چیزیں پڑی تھیں وہیں دوسری طرف اس کے بنائے ہوئے مجسمے رکھے تھے۔

رقاصہ کا کوئی تین فٹ اُونچا مجسمہ۔

کتا گھماتا ہوا چھوٹا سا لڑکا......لڑکے کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور چھوٹا سا Pekinese اصل سے کتنا قریب نظر آرہے تھے۔ فیصل مبہوت دیکھتا رہ گیا......کئی منٹ......پھر اس نے رقاصہ کی طرف دوبارہ نظر ڈالی۔ بھرت ناٹیم کے مخصوص انداز میں دل کی باتیں کہتی ہوئی......ایک ابرو اُوپر کو اٹھائے ہوئے ہاتھوں سے کنول کا پھول بنائے ایک گھٹنا آدھا خم کیے، جس کے پاؤں کی ایڑھی زمین سے لگی ہے اور پنجہ ہوا میں اُٹھا ہے۔ اُس کے لباس کی سلوٹیں پیٹ سے ہوتی ہوئی پیروں کے قریب آکر پھیل گئی ہیں......کس قدر دلکش......وہ انگشت بدنداں دیکھتا رہ گیا۔ وجیہہ شانوں والے مرد کا بائیں جانب دیکھتا ہوا چھاتی تک تراشا گیا مجسمہ۔ آدھے ٹوٹے پنکھ والی فاختہ کا مجسمہ......اور اس طرح کے کچھ اور شاہکار۔

یہ فن پارے اس طرح بے وقعت پڑے ہیں......فیصل رنجیدہ سا ہوگیا۔ اس نے ملیحہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ فوراً مسکرا دیا۔

''ارے واہ۔ لاجواب۔'' اس نے تالیاں بجائیں۔

''ذرا سا میں......کچھ دخل دوں......اگر آپ کی اجازت ہو تو۔'' ملیحہ نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

''اجازت ہے......'' وہ مسکرائی۔

فیصل نے قمیض کی اوپری جیب سے قلم نکالا اور سنگ مرمر کی فاختہ کے قریب چلا گیا۔ اُس نے قلم سے فاختہ کی آنکھ کی پتلی سیاہ کر دی۔ فاختہ ایک دم جیتی جاگتی سی جیسے دیکھنے لگ پڑی۔ ملیحہ نے کچھ پل فاختہ کو غور سے دیکھا تو وہ ٹھٹھکا۔

''مٹ بھی سکتا ہے......سیاہی ہے......''اُس نے جلدی سے کہا تو ملیحہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ملیحہ کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔

''فن شناس ہو......'' وہ بولی اور جلدی سے سر جھکا لیا۔ مگر فیصل نے اُس کے چہرے پر کرب کے تاثرات چھاتے اور پھر غائب ہوتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ وہ آگے بڑھی اور ایک نامکمل مجسّمے کے قریب ٹھہر گئی۔ اس نے چھوٹی سی ہتھوڑی ہاتھ میں لے لی۔

''اس نے کیا ہے میری انگلی کو زخمی......'' وہ مسکرا کر بولی۔

''اِس کی خاطر......''اس نے نامکمل مجسّمے کے نصف حصّے پر جو قدرے چھوٹا تھا ہاتھ رکھ دیا۔ جس پر کچھ ہی ضربیں پڑی تھیں۔ مگر اندازہ ہوتا تھا کہ کیا تراشا جانے والا ہے۔

''ماں اور بچّے کا مجسّمہ بنے گا......یہ۔''

''سمجھ گیا تھا میں......واہ......'' وہ خوشدلی سے مسکرایا۔

''چلو چائے پیتے ہیں......'' وہ زینے کی طرف بڑھنے لگی تو فیصل کے لبوں پر ایک شعر ابھر آیا۔

میں شاعر ہو گیا ہوں۔ اُس نے مسکرا کر سوچا۔

''میں نے ایک شعر کہا ہے۔ سنیں گی......'' وہ بولا۔

''ایسا......؟'' وہ مسکرائی تو اس نے بہ آوازِ بلند گلا صاف کیا۔

''جی ہاں......عرض کیا ہے کہ:

مری آنکھوں سے گذر کر روح میں آن بسے
تیرے چہرے پہ جو آ ٹھہرے تھے غم کے سائے''

شعر سناتے ہوئے وہ اداس سا ہو گیا۔

''تو...... یہ شوق بھی پال رکھا ہے جناب نے...... کب سے......؟'' وہ خوش دلی سے بولی۔

''ابھی اسی وقت سے......'' وہ مسکرا دیا۔

''واہ...... اچھا شعر کہہ لیا آپ نے...... آپ اچھے شاعر ہو سکتے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''یہ سب آپ کے فن کا کرشمہ ہے کہ میں پل بھر میں...... شاعر بن گیا۔''

وہ چلتا ہوا مرد کے مجسمے کے قریب پہنچ گیا۔

''بالکل مجھ جیسا لگتا ہے نا......'' اُس نے مجسمے کی طرح کھڑے ہو کر گردن بائیں جانب موڑی...... اور بائیں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے دیکھے بغیر آپ نے میرا مجسمہ کیسے بنا لیا......'' وہ گردن دوسری طرف کیے بولتا رہا اور ملیحہ کے کھنکتے ہوئے قہقہے یکے بعد دیگرے گونجنے لگے۔

''اب ہٹ بھی جاؤ...... وہاں سے......'' وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی تو وہ مجسمے کے پاس سے چلا آیا۔

برآمدے میں چائے لگا دی گئی تھی۔ ملیحہ نے کیتلی سے ٹی کوزی ہٹا کر کیتلی کو چھوا۔

''کچھ...... ٹھنڈی نہیں ہو گئی......؟'' اس نے ایک پیالی میں چائے انڈیلی تو فیصل نے پیالی کو انگلی کے پوروں سے چھوا۔

''نہیں تو......'' وہ جلدی سے بولا۔

''چلے گی......'' وہ مسکرا دیا تو وہ بھی مسکرا دی۔

غلام گردش کی بڑی سی گھڑی نے چھوٹے چھوٹے سات گھنٹے بجائے تو فیصل نے

اجازت طلب کی۔

''پھر کب آؤ گے...... تم...... بہت زیادہ مصروف آدمی؟'' وہ بھی کرسی سے اٹھی۔

''بہت جلد......''

''جیسے......''

''دو چار روز میں۔''

''دو میں یا چار میں؟''

''آپ حکم کریں جب...... حاضر ہو جاؤں گا......''

''تمہاری طرف کب بند ہوتا ہے۔ مارکیٹ......؟''

''منگل کو بازار بند رہتا ہے......''

''تو بس پیر کو رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھالو......؟''

''میں شام کو حاضر ہو جاؤں گا...... مگر کھانا۔ گھر......''

''بالکل ٹھیک...... شام کو آ جاؤ اور رات کو کھانا کھا کر چلے جانا۔ نا...... تمھیں...... کیا پسند ہے...... میں وہی بناؤں گی......'' وہ دروازے پر کھڑی رہی۔

''......ہاں...... بٹیر کے کوفتے...... پیاز کا شوربہ...... مچھلی کی چٹنی۔'' وہ مسکرایا تو وہ ہنسی۔

''مچھلی کے کوفتے...... بٹیر کا شوربہ...... پیاز کی چٹنی، چلے گی......؟ اور ساتھ میں......''

''دوڑے گی...... اور ساتھ میں دس بارہ چیزیں اپنی پسند کی بناڈالیے گا...... میں زیادہ نہیں کھاتا...... خدا حافظ......''

وہ دروازے پر کھڑی ہنستی رہی۔

''خدا حافظ۔'' جب وہ پھاٹک سے نکل گیا تو وہ اندر کو پلٹ آئی۔

ملیحہ کے گھر کے موڑ سے نکل کر وہ بڑی سڑک پر آیا تو موڑ کی طرف مڑتی ہوئی لمبی سی

ایک گاڑی کی پچھلی نشست پر ایک چھوٹا آدمی بیٹھا نظر آیا۔

......بٹیر کہیں کا......اُس نے زیرلب کہا اور ایک قہقہہ اُچھال کر گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

اُس دن اُس نے عافیہ کے ساتھ فون پر ڈھیروں باتیں کیں۔

''عافیہ بھابھی میں شادی کر رہا ہوں......'' وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو پگلے......'' وہ ہنسیں ''میری اجازت کے بنا ہی......'' اس نے مصنوعی حیرت ظاہر کی۔

''ہوں......جیسے کہ آپ مجھے اجازت دے دیں گی......''

''تم بول کر تو دیکھو......تمہارے جیسی پیاری ہو......یہ شرط ہے......''

''مجھ سے کہیں زیادہ عافیہ بھابھی......''

''سچ کہہ رہے ہو......؟ کون ہے......کون لوگ ہیں......کن کی ہے......'' عافیہ کی آواز میں خوشی بھر گئی تھی۔

''ارے ملیحہ اصغر علی ہے۔ اس پھوے اکبر علی سے اس پری کو طلاق دلوا کر رہوں گا......آپ دیکھ......''

''چپ......بدتمیز کہیں کا......'' عافیہ پر ہنسی کا دورہ پڑا۔

''ایسا نہیں کہتے......'' ہنسی کچھ کم ہوئی۔

''میری عمر کی ہے......کچھ شرم کرو......سوچتے نہیں مذاق کرنے سے پہلے......اُلو......بدھو۔''

کون کم بخت مذاق کر رہا ہے......عافیہ بھابھی......رشتہ بھی پچاس فی صد طے ہو گیا......میں راضی ہوں......''

''اب اُس کو راضی کرنا ہے......ہے نا۔''

''مگر وہ پھوا......''

''خوب خبر لوں گی تمہاری...... ذرا آؤ تو سہی......'' وہ ہنستی رہیں۔

''اکبر بھائی نہیں بلاسکتا......اُلو......''

فون رکھ کر فیصل مسہری پر دراز ہوگیا۔ گہرے نیلے نائٹ بلب کی نرم شعاؤں میں کانچ کے جھل مل کرتے لیپ شیڈ پر ملیحہ کا دروازے پر کھڑا مسکراتا سراپا نظر آیا تو اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ یہ کیا ہورہا ہے......اُس نے آنکھیں کھول دیں......کہیں سچ مچ......میرا ارادہ......ایسا تو نہیں......

اُس نے مسکرا کر کروٹ لی اور سو گیا۔

کالج کے بہت سے لوگ کشمیر گئے تھے۔ ہوسٹل کی کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ وارڈن بھی تھیں۔ سب لوگ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام وغیرہ جانے کے پروگرام بنا رہے تھے۔ ملیحہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ وارڈن نے پوچھا کہ ملیحہ تم کہیں نہیں جانا چاہتیں تو بولی تھی کہ ایسی بات نہیں جہاں آپ کہیں میم، مگر آج میں ریسٹ کرنا چاہتی ہوں۔

عافیہ کو وہ واقعی بے چین سی نظر آئی تھی۔ اُس روز وہ بھی گروپ کے ساتھ مغل باغات دیکھنے نہیں گئی۔ جس گیسٹ ہاؤس میں اُن کو ٹھہرایا گیا تھا وہ جہلم کے کنارے تھا۔ ملیحہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑکی تک آگئی اور آسمان میں اڑتی ہوئی سفید مرغابیوں کو دیکھنے لگی۔

''اللہ......ابھی تو کتنی Up Set تھیں تم......کہ میں ڈر گئی کہ شاید بیمار ہو......یا کیا بات ہے......'' عافیہ نے حیرت سے کہا۔

''ارے ہاں یار......بیمار ہی تو ہوں۔ بلکہ بیقرار ہوں......'' وہ مسکرائی۔

''عافیہ......تمھیں یاد ہے جب ہم پل پار کر کے کنارے کی کسی کچی سڑک سے آ رہے تھے۔ بازار کی پچھلی طرف سے......؟''

''ہاں...... صبح...... وین میں نا...... ٹورسٹ ریسپشن سنٹر سے آتے ہوئے؟''

ہاں...... بالکل......''

''تو؟''

''تو راستے میں...... میں نے کنارے پر ایک باغ میں ایک نہایت خوبصورت مجسّمہ دیکھا تھا...... عافیہ اتنا حسین...... اتنا حسین...... کہ...... عافیہ میں جب ہی سے بے چین ہوں...... وہ مجسّمہ وہاں کیسے آیا...... کس کا تھا...... دیکھو نا کسی کتابچے میں اُس کا ذکر نہیں ہے۔ ان سب میں سے...... اُس جگہ کی کوئی نشاندہی بھی نہیں ہے......''

ملیحہ پھر مسہری کے کنارے آن بیٹھی اور ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جاری کتابچے اپنے سامنے پھیلا کر اُن پر جھک گئی۔ عافیہ بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''دیکھو نا...... سب صحت افزا مقامات...... آثارِ قدیمہ...... اونتی پُور اور پٹن کے کھنڈرات...... چشمے...... پہاڑیاں...... غار...... عجائب گھر...... مگر وہاں کا...... اُس جگہ کا کوئی ذکر نہیں...... وہاں جانا ہے مجھے۔ عافیہ...... وہ زیادہ دور نہیں ہے...... ڈھونڈ لیں گے......'' اُس کی آواز میں اس قدر بے قراری تھی کہ عافیہ کھڑی ہوگئی۔

''چلو ڈھونڈتے ہیں......'' عافیہ نے پاؤں چپلوں میں ڈالتے ہوئے کہا......

''ادھر، ویٹر سے پوچھ لیں گے...... ٹیکسی کا انتظام کر دے گا۔''

''چائے آ کر پئیں گے۔'' ملیحہ نے چہک کر کہا۔ ''تمھیں وہاں بہت اچھا لگے گا عافی۔''

''ٹھیک ہے بھیا۔ چلو۔'' عافیہ مسکرائی۔

ویٹر کو کسی مورتی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر اُس نے یہ ضرور کہا کہ منیجر کو اس بارے میں ضرور معلوم ہوگا۔ منیجر گیسٹ ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔

عافیہ نے منیجر کے لوٹنے تک ملیحہ کو چائے پینے پر آمادہ کیا۔ ڈائننگ ہال کے برآمدے

میں سے باہر کا دلفریب منظر نظر آ رہا تھا۔

''عافیہ دیکھو تو...... وہ کلس......'' ملیحہ نے ندی کی دوسری طرف کوہِ سلیمان کی چوٹی پر ایستادہ شنکر آچاریہ کے مندر کی طرف اشارہ کیا۔

''دنیا میں...... کیسے کیسے عظیم لوگ آتے ہیں...... عظیم فنکار...... اور چپکے سے چلے جاتے ہیں......'' ملیحہ نے کہا۔

عافیہ چپ چاپ اُس کے چہرے کو تاکتی رہی۔

''چائے اچھی نہیں ہے کیا......'' عافیہ نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں یار...... تم بھی حد کرتی ہو......'' ملیحہ نے دونوں ہاتھ میز پر اوندھے رکھ دئے۔

''بہت بے قرار ہو نا۔ مورتی کو دیکھنے کی خاطر......'' عافیہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

''ہوں تو...... لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میں...... وہ مورتی میرے سامنے ہوگی...... دراصل...... عافیہ...... میں یہ سوچ رہی ہوں کہ فن کار بھی تو ایک طرح سے۔ ایک طرح سے عبادت گزار ہوتا ہے...... نہیں؟ فن کی۔ اپنے فن کی معراج کی تلاش میں جیسے کوئی بزرگ خدا کی تلاش میں۔ یعنی کہ وہ دیکھو...... ایک انسان......'' ملیحہ نے پہاڑی کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ ایک انسان نے ادھر عبادت کی...... دوسرے نے یہ عظیم الشان مندر تراش کر ایک اور عبادت نہیں کی کیا؟...... بولو نا......!''

''ہاں...... ایسا بھی کہہ سکتے ہیں......'' عافیہ نرمی سے بولی۔

''نہیں ایسا ہی ہے۔ اصل میں فن کی قدر ہی نہیں ہمارے یہاں......'' ملیحہ کے چہرے پر بے زاری چھا گئی۔

''نہیں...... ایسا نہیں ہے...... میں تو فخر کرتی ہوں اس بات پر کہ تم...... کہ میری دوست اتنی بڑی کلاکار ہے......'' عافیہ نے فروٹ کیک کی پلیٹ اُس کی طرف سرکائی۔

''اب تم ذرا روحانی غذا کے ذکر کو ملتوی کر کے کچھ اپنے اس پاپی پیٹ کا بھی خیال

کرو...... کئی گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا تم نے۔''

منیجر صاحب آئے تو سارا ماجرا سن کر بڑی خوشدلی سے مسکرائے......

''میں سمجھ گیا میڈم۔آپ تیار ہو جائیں، ابھی چلتے ہیں ہم وہاں۔''

''کیا واقعی......''ملیحہ نے خوشی سے چھلکتی ہوئی آواز کی لغزش کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی۔

''جی ہاں۔بالکل۔''منیجر ابرار وانی خود اعتمادی سے مسکرایا کیے۔

''میری یہ وادی بڑی قدیم اور عظیم ہے......''ابرار کی آواز چھوٹی چھوٹی لہروں سے ٹکرا کر اُبھری......وہ بڑے سکون سے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔عافیہ نیلے روغن اور سرخ پردوں سے مزئین چھوٹے سے شکارے کا عکس جہلم کے پانی میں دیکھنے لگی۔ملیحہ نے گردن ادھر ادھر گھمائی۔

''اُدھر پل سے بھی راستہ ہے......مگر یہ Short Cut ہے۔''اور پھر اس پانی سے گزر جانے کا ایک اپنا ہی لطف ہے جسے صحیح معنوں میں صرف ہمارے اجداد نے ہی محسوس کیا ہوگا۔سرینگر میں جہلم پر تیس پُل ہوا کرتے تھے۔مگر یہ پُل کشتیوں کے پُل تھے۔یعنی ایک کشتی سے دوسری کشتی باندھ کر ایسے ہی سلسلہ دوسرے کنارے سا جاملتا۔پہلا لکڑی کا مستقل پُل ہمارے ہر دلعزیز بادشاہ سلطان زین العابدین نے بنوایا تھا اور نام زینہ کدل رکھا گیا۔''ابرار نے کہا۔

''نہیں......ایسی کوئی بات نہیں ہے......یہ تو اور بھی اچھا کیا آپ نے......''ملیحہ نے نیلے شفاف آسمان کو دیکھا۔

''ایسی تاریخ دنیا کے کسی ملک کی نہیں ہے۔پانچ ہزار برس پرانی ہسٹری ہے ہمارے پاس۔میں خود تاریخ کا سٹوڈنٹ رہا ہوں......بلکہ نوکری کے ساتھ ساتھ کشمیر کے قدیم فنون پر Ph. D کر رہا ہوں۔اور اس دوران تاریخ نے مجھ پر ایسے انکشاف کیے کہ......دنگ رہ

گیا...... میں......"

"جیسے......؟" ملیحہ اور عافیہ میں سے کسی نے پوچھا۔

"ضرور بتاؤں گا۔ مگر فی الحال ہمیں یہیں اترنا ہے۔"

کشتی بان شکارے کو کنارے لگا کر اُتر گیا اور جہاں پانی کنارے کی مٹی میں ہلکے ہلکے گھُلا ہوا نظر آ رہا تھا، وہاں وہ پنڈلیوں تک پانی میں کھڑا ہو گیا۔

"اب آپ آ سکتے ہیں...... آرام سے......" اُس نے کشتی کی نوک سے بندھی رسی کو کھینچ کر مضبوطی سے تھام لیا۔ ملیحہ اور عافیہ ذرا ذرا جھولتی ہوئی کشتی میں ڈگمگاتی سی اُتر آئیں۔

کنارے کی منڈیر ختم ہوتے ہی سڑک تھی۔ سڑک کے اُس پار ایک پرانی دومنزلہ عمارت تھی جس کی دیواروں پر سفیدی کی گئی تھی۔ عمارت اور باغیچے کو ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے بڑے سے پھاٹک پر ایک محافظ کھڑا تھا۔

"یہ رہی آپ کی منزل......" ابرار وانی نے مسکرا کر پہرے دار کو دیکھا اور پھاٹک میں لگا کواڑ وا کیا۔

ملیحہ اور عافیہ اندر داخل ہوئیں تو باغیچے میں نصب زمانۂ قدیم کی کچھ مورتیوں اور پتھر کے کچھ اوزاروں اور ہتھیاروں کے علاوہ چنار کے عمر رسیدہ درختوں کی ٹہنیوں میں چھپتے پھرتے طیور کی چہکار نے اُن کا استقبال کیا۔

"یہی مورتی تھی نا میڈم......" ابرار نے سرمئی پتھر کی ایک نہایت قدیم مورتی کی طرف دیکھا...... سپاٹ سی مورتی کا صرف دھڑ موجود تھا۔

عافیہ نے بے یقینی سے ملیحہ کی جانب دیکھا کہ اپنی دوست کے مزاج سے وہ بخوبی واقف تھی۔

"نہیں نہیں......" ملیحہ نے تڑپ کر دائیں بائیں دیکھا۔

"یہ...... یہ وہ جگہ نہیں ہے......" وہ بولی۔

''یہی تو ہے عجائب خانہ...... جہاں آپ کو ماضی قریب اور ماضی بعید کی کئی چیزیں نظر آئیں گی۔ آپ آیئے۔ اندر چلتے ہیں......''

وہ لوگ عمارت میں داخل ہوئے۔ ملیحہ بے دلی سے آگے بڑھنے لگی۔ پھر اندر پرانی اور بہت پرانی اور بہت ہی پرانی چیزوں نے اُس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی کہ پہلے ہی ہال میں پتّھر کی قدیم مورتیاں کچھ سالم اور کچھ نیم سالم اپنے اپنے دور کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ دھات اور مٹی کے قدیم سکّے، زیورات اور ملبوسات، حنوط شدہ چرند و پرند، بوتلوں میں بند سانپ، نیولے۔ قدیم ترین ہاتھی کی چوڑی سی دیو قامت کھوپڑی کا آدھا حصّہ (عجائب گھر کے گائڈ نے بتایا کہ اس کھوپڑی کا باقی نصف جنوبی افریقہ کے کسی عجائب خانے میں محفوظ ہے)۔ کتنے عجب ہیں دنیا کے معاملات۔ ملیحہ نے سوچا تھا۔ آبی اور زمینی نقشے، راجاؤں، بادشاہوں کے معاہدے، لباس، ہتھیار، ازمنۂ قدیم وقت کو پھلانگ پھلانگ کر ایک جگہ اکٹھے ہوگئے تھے۔ ملیحہ سوچتی رہی۔ رہ رہ کر اُسے وہ مورتی بھی یاد آجاتی۔ آخر کہاں دیکھا تھا اُس نے اُسے......؟

عجائب خانے سے لگی داہنی جانب ایک لائبریری تھی، جس میں نادر کتب کا ذخیرہ بھی تھا۔ منیجر اُن کو لائبریری دکھانے بھی لے گیا اور اپنی اور ان کی پسند کی چند کتابیں انھیں اپنی ممبر شپ پر دلوادیں۔

''ہوسکتا ہے کہ ان تاریخ کی کتابوں میں...... آپ کو...... آپ کو ایسی ایسی چیزوں کے اشارے ملیں کہ آپ حیرت زدہ رہ جائیں...... بلکہ...... میں تو آپ لوگوں کو کچھ ایسے مقامات دکھانے لے جاؤں گا جو غیر معروف ہیں مگر نہایت اہم...... میڈم سے بات کروں گا۔ آپ لوگ کل جھیلیں باغات وغیرہ دیکھ لیں پھر میں کھنڈرات کی سیر کراؤں گا...... عین ممکن ہے کہ آپ کی کھوئی ہوئی مورتی آپ کو وہیں کہیں مل جائے......'' وہ مسکرایا تو عافیہ خوشدلی سے اور ملیحہ بے دلی سے مسکرائی۔

اگلے روز اونتی پور اور پٹن کے کھنڈرات دیکھنے کے بعد کارواں ابرار وانی کی نگرانی میں اندرونِ شہر کی جانب روانہ ہوا۔ جہاں خانیار کے مقام پر روزہ بل کہلانے والا ایک قدیم مقبرہ تھا۔ مقبرے پر زیارت حضرت یوز آصف کندہ تھا۔ منیجر نے بتایا کہ ایک روایت یہ بھی چلی آ رہی ہے کہ یہ تربت یسوع مسیح کی ہو سکتی ہے جس پر سولی کے نشان لیے دو پاؤں بھی تراشے گئے ہیں۔ بلکہ اُس نے یہ تک کہا کہ وادی کے بیتھ پورہ کے علاقے میں ایک مقام قدیم زمانے سے حضرت موسیٰ کا مزار کہلاتا رہا ہے...... واللہ عالم...... لڑکیاں سنتی رہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتی رہیں۔

رات کو سب لوگ تھک کر سو چکے تھے۔

وہ مورتی کہاں دیکھی تھی۔ ملیحہ کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ وہ کتابیں الٹتی پلٹتی رہی۔

تاریخ گواہ ہے کہ پچھلے وقتوں میں تجارت پیشہ لوگ مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب آتے جاتے رہے تھے۔ زمین یا سمندری سفر کر کے۔ صدیوں تک یہودی بھی کشمیر آتے رہے تھے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کشمیر میں قبریں یہودیوں کے انداز میں یعنی مشرق سے مغرب کی جانب بنائی گئی ہیں بلکہ ان پر عبرانی تحریر بھی ہے۔ کشمیر کے گوجر خود کو اسرائیل کی اولاد بتاتے ہیں۔ کئی اشیاء جیسے لباس، ٹوپی، ناؤ کھینے کا چپو وغیرہ اب بھی اسرائیل میں مستعمل چیزوں سے مطابقت لیے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ کشمیر کی پرانی عمارات میں یہودیوں کی تعمیر کی طرز پر ہی یعنی زینے مغرب کی طرف سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے ملیحہ کی دلچسپی بڑھنے لگتی مگر کچھ پل کے علاوہ وہ اپنا دھیان مورتی سے ہٹا نہیں سکی۔

انسانی تاریخ کس قدر دلچسپ ہوا کرتی ہے...... اور اگر؟...... اور اگر؟...... اگر فن نہ ہوتا...... یعنی اگر فن کار نہ ہوتا...... ملیحہ سوچتی۔

یعنی ......کمہار نہ ہوتا...... تو موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی...... اور اِنکا کی تہذیب...... کیسے واضح ہوتی...... برتن ساز...... فن کار کی طرح ہی...... مجسمہ ساز کی ہی طرح اہم ہوتا ہے......

اُس نے کتاب کا ورق پلٹا۔

ان مقامات کے ناموں کی فہرست درج تھی جن کا ذکر انجیل مقدس اور طوریت میں کیا گیا ہے اور جو انہی ناموں سے وادی میں بھی موجود ہیں۔ جیسے مٹن، نابو، ڈور، اُڑی وغیرہ ہیں۔ کچھ جوں کے توں اور کچھ غالباً بگڑ گئے تھے۔ جیسے گول گوت سے گلگت، ہاروان سے ہارون۔ دنیا کے شمالی خطّوں سے لوگ کشمیر آئے۔ اور یہاں کی زبان میں فارسی، عربی، سنسکرت، عبرانی اور نہ جانے کون سے الفاظ ملے۔ اُس سے یہ...... اس سے وہ۔

ملیحہ ورق الٹتی گئی...... ان محققین کی قوم بھی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ کسی چیز کو کسی سے ملانا چاہیں تو ایسے ایسے جواز پیش کرتے ہیں کہ ذہن سوچ سوچ کر پریشان ہو اُٹھے......

کئی فرقے خاص مواقعوں پر سنکھ بجاتے ہیں جیسے ہندو اور یہودی...... اور کچھ اور قبائلی بھی...... کبھی کبھی کتنی مطابقت...... کتنی مماثلت ہوتی ہے...... ملیحہ سوچتی۔ پھر تو...... دیکھا جائے تو وسط ایشیائی ممالک کے باشندوں کی شکلیں کتنا ملتی جلتی ہیں ایک دوسرے سے...... لباس بدل دیں تو شناخت بدل جائے۔

وہ بڑی دیر بعد مسکرائی۔ اُس نے کتاب بند کر دی۔ کہتے ہیں برِاعظم الگ ہونے سے پیشتر جڑے ہوئے تھے۔ جبھی تو ایک خطےّ کی تہذیب کی کڑی ہزاروں میل دور کسی دوسرے خطےّ کے ساتھ ملتی دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے Mesopotamia اور Turkmania کی تہذیب...... سندھ کی تہذیب سے ملتی ہے...... وہاں ایک سے دیوتا پوجے جاتے ہیں...... دنیا بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ ایک کونے کے انسان کے ساتھ دوسرے کسی کونے کے باسی کی کوئی نہ کوئی مطابقت نکل ہی آتی ہے...... بس ذرا تحقیق کی ضرورت ہے...... یہ بھی بڑا لبھاونا کام ہے مگر...... یہ تحقیق...... قطعی راست باز ہو تو......

کشمیر۔تم بڑے خوبصورت، دل پذیر و ہوش ربا ہو۔ان نیم بوسیدہ کتابوں میں تم نے علم کے خزانے چھپا رکھے ہیں۔محفوظ رکھنا اپنے اس علم کو۔اردو کی ان نایاب کتب کو آثار قدیمہ نہ ہو جانے دینا۔عبرانی زبان کی طرح، جسے لوگوں نے گھروں میں زندہ رکھا۔ او راب کوئی چالیس پینتالیس برس سے باقاعدہ اس زبان کو صفحۂ قرطاس پر اُتارا جا رہا ہے۔تم بھی اردو سے اپنی محبت کم مت کرنا کہ اس میں علم کے خزانے چھپے ہیں۔دین اور دُنیا کے عظیم حقائق پنہاں ہیں۔اے خلدِ بریں اور کیا کیا پوشیدہ رکھا ہے تم نے اپنے دامن میں۔اور......اور یہ مورتی کہاں چھپا رکھی ہے آخر؟

وہ مورتی کہاں ہے......

ندی کے کنارے کے سب مقامات دیکھ لیے......

ملیحہ کی تھکی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

کہاں ہو تم......عجائب خانہ چھان مارا۔اندر باہر سے۔

ملیحہ کو نیند کے جھونکے آنے لگے۔

کس نے تراشا ہوگا اُسے۔ملیحہ نے آنکھیں بند کیں تو لکڑی کے دستے والی سٹیل کی نازک ہتھوڑی اور چھوٹی سی چھینی اس کے ہاتھ میں آگئی......

اُسے یاد آیا جب اُس نے بس کی کھڑکی سے مورتی کو دیکھا تھا تو اُسے ایسی ہی گہری نیند آیا چاہتی تھی۔

وہ بڑے سے پہاڑ کے دامن میں، چٹان سے کاٹ کر پہلے سے الگ کی گئی مرمر کی قدِ آدم سِل پر ضرب لگانے لگی۔کس بھلے آدمی نے قدِ آدم سِل کو اس کی خاطر پہلے ہی چٹان سے کاٹ کر الگ رکھا تھا۔وہ مسکرائی۔کتنی آسانی سے تراش رہی تھی وہ مورتی کو......سفید پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر اِدھر اُدھر چمکتے بکھرتے لطیف سی موسیقی چھیڑ دیتے......چھینی پتھر پر ایسے پھسل رہی تھی جیسے پتھر موم ہو گیا ہو۔

وہ مورتی تراشتی رہی اور سوتی رہی۔

صبح نیند کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوتے اچانک اُسے یاد آیا کہ اُس نے مورتی کے پاس صلیب کا نشاں دیکھا تھا۔ اُس نے کمرے سے فون کر کے یہ بات منیجر کو بتائی تو جواب نہایت حوصلہ بخش ملا۔

وہ عیسائی فرقے کا ایک وسیع قبرستان تھا۔ جس میں صدیوں پرانے چنار پہرے داروں کی طرح ایستادہ تھے...... کچھ مقبرے بھی صدی بھر پہلے کے تھے۔ لمبی لمبی قبریں۔ کہیں صلیب کے نشان...... کہیں بڑے چھوٹے کتبے، ملیحہ آگے چل رہی تھی۔ آس پاس...... اوپر دیکھتی ہوئی...... چناروں پر چڑیاں بول رہی تھیں۔

قبرستان بھی عالی شان ہوا کرتے ہیں۔

اُس نے نہایت سکون سے سوچا تھا۔

وہ کچھ پل کے لیے رک کر ایک کتبے کو دیکھنے لگی...... جس پر Anchor کا نشان بنا تھا۔ پھر ٹھٹھک کر آگے بڑھ گئی۔ واپسی پر دیکھے گی اسے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے ہی آگے جا رہی تھی...... قبرستان کے دوسرے کنارے کی طرف۔ اس اندازے سے کہ صبح وین سے نظر آنے پر وہ مجسمہ سڑک سے کتنی دوری پر رہا ہوگا جو وہاں سے دکھائی دے گیا تھا۔ وہ عافیہ سے کئی سو قدم آگے نکل گئی تھی۔

''عافیہ......'' ملیحہ کی بیقرار آواز سن کر عافیہ نے دیکھا کہ وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ کر نہایت انہماک سے کچھ دیکھ رہی ہے۔ عافیہ بھاگ کر اُس کے پاس پہنچ گئی...... اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

وہ ایک خاتون کا مجسمہ تھا۔ جو پچیس برس کی عمر میں انتقال کر گئی تھی۔ اُس کے لیفٹیننٹ کرنل شوہر نے اپنی نوعمر شریک حیات کی یاد میں وہ مجسمہ بنوایا تھا۔ عیسائی دُلہن کے لباس میں۔ حسن کا ایک مکمل شاہکار...... وہ ہاتھوں میں پھول لیے سر داہنی جانب کو ذرا سا جھکائے

بیٹھی تھی۔ سنگِ مرمر سے تراشیدہ اس مجسّمے کا رنگ سفید تھا۔ سنگ تراش نے آنکھوں کی پتلیوں کو جس مہارت سے تراشا تھا وہ لاجواب تھی...... پتلیوں کو نہایت مبہم سا نقش کر کے انھیں ہلکے رنگ کی مخصوص مغربی آنکھوں کی صورت دے دی تھی۔

ڈھیلی ڈھالی عبا کے شکنوں میں سے جھانکتا چھپتا حسین سراپا زندہ زندہ سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی اُس کا آنچل ہوا کے جھونکے سے لہرا اُٹھے گا۔ بغیر چھوئے یقین کرنا مشکل لگتا تھا کہ یہ لباس، یہ اوڑھنی، یہ حُسن صرف پتھر ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

ملیحہ جانے کہاں کھو چکی تھی...... وہ کئی بار دیکھنے کے بعد بھی نئے سرے سے اُسے کسی گوشے سے دیکھنا شروع کرتی۔ اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔ عافیہ کبھی مجسّمے اور کبھی ملیحہ کو دیکھتی کہ ملیحہ خود پتھر کی مورت سی بن کے رہ جاتی۔ اپنے آپ میں ایک مجسمہ ہو جاتی۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گئی اور مجسّمے کو دوبارہ دیکھنا شروع کیا۔

قبر پر ایک چبوترہ تھا سنگ مرمر کا اور اُس چبوترے کے اوپر اس سے چھوٹا دوسرا چبوترہ۔ دوسرے چبوترے کے ساتھ مرمر کی ہی بڑی سی صلیب لگی تھی۔ پہلے اور دوسرے چبوترے کے سامنے والی طرف اوپر سے نیچے تک انگریزی میں عبارت درج تھی۔ ملیحہ نے اسے ایک بار پھر پڑھا:

IN LOVING MEMORY OFMABEL EMILY

THE DARLING WIFE OFLIEUT. COL. J. A. CUNNINGHAM,

WHO DIED AT SRINAGAR

20 JULY 1904 AGED 25 YEARS

اوپر کے چبوترے کی داہنی جانب کونے پر صاحبۂ قبر خود بیٹھی تھی...... اپنی ہی تربت پر، بالکل قدِ آدم اور مکمل...... اُس کا آنچل سے آدھا ڈھکا سر، کراس کے داہنے کونے کے بالکل قریب تھا۔ دوپٹے کا باقی حصّہ اس کے داہنے شانے سے ہوتا ہوا اُس کی عبا سے لگا، کمر سے ہوکر زمین تک پھیلا چلا گیا تھا۔ چپلیں پہنے اُس کے خوبصورت پاؤں ذرا ذرا سے جھانک رہے تھے۔ اُس نے داہنے ہاتھ میں زیتون کی شاخوں اور پھولوں سے گندھا چھوٹا سا دائرہ تھام رکھا تھا جو کبھی Wreath بنا اُس کے آنچل سے ڈھکے سر پر ٹھیک بیٹھتا ہوگا...... پھولوں کے تاج کی صورت۔

میبیل ایملی! کس کو دو گی تم یہ پھولوں کا ہار۔ یہ شاخِ زیتون جس پر کبھی خزاں نہ آئے گی، جو قیامت تک نہ مرجھائیں گی...... میبیل ایملی! تم کیوں مر گئیں...... اتنے حسین لوگ کبھی مرتے ہیں کیا...... مگر...... تم تو زندہ ہو...... تم قیامت تک زندہ رہو گی...... تمھیں کسی عظیم فن کار نے ابدی حسن عطا کر دیا ہے۔ تم سے تمھارا حسن وقت بھی نہیں چھین سکے گا۔ فن اُس عظیم سنگتراش کو سلام کرتا ہے......

ملیحہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں نہایت بے قراری سے مجسّمے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"کون ہوگا یہ عظیم فن کار...... عافیہ...... دیکھو...... دیکھو...... فن یہاں ختم ہو جاتا ہے...... اس سے بہتر کون بنا سکتا ہے کوئی مورتی ایسی...... کہ یوں...... یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی اٹھ کر کسی طرف چل پڑے گی۔ قیامت تک زندہ رہنے والی یہ دلہن...... یہ اَمر دُلہن...... دیکھو تو...... زندہ ہے...... یہ ہونٹوں کی ابدی مسکراہٹ...... یہ گردن کا شرمیلا خم...... یہ سمٹے سمٹائے انداز میں کونے پر ذرا سا ٹک کر بیٹھ جانا...... اِسے کون مرحومہ کہے گا...... محبت نے اسے لافانی کر دیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل جے۔ اے۔ کننگھم جانے کہاں مٹی میں مٹی ہو گیا ہوگا اپنی محبت کو امر کر کے۔ مگر اس فن کار کا تو کوئی نام بھی نہیں جانتا...... کیا یہ کسی

تاج محل سے کم ہے......؟ مہابلی پورم، ایلیفینٹا، یا اجنتا، الورا کے کسی فن پارے سے......؟

عافیہ......اس فن کار کے انگوٹھے قلم تو نہیں کر دیئے ہوں گے نا؟

کون ہوگا یہ سچّا فن کار......عافیہ تربت پر لکھی کہانی جھوٹی ہے......''

وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہتی گئی......''سچ تو صرف یہ فن پارہ ہے''۔

وہ زمین سے اٹھی اور دوسرے پہلو سے مجسّمے کو دیکھنے لگی......اب وہ مسکرا رہی تھی......

مگر اگلے ہی پل پھر اُداس ہوگئی۔

''عافیہ......کون ہوگا وہ......اور کیا کیا تخلیق کیا ہوگا اُس کے ان سونے کے ہاتھوں نے؟'' وہ مجسّمے کو کئی منٹ تک بائیں جانب سے گھورتی رہی۔

''اسی لیے کہتے ہیں نا......کہ فن کبھی نہیں مرتا......یہ سنگتراش اس مجسّمے میں حیات ہے......ہے نا......دیکھو عافیہ میں اُس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی ہوں جو اس لڑکی کے حسن کے پرتو میں زندہ ہیں......جو......جو تقریباً سو سال سے اس خاموش قبرستان میں بے شمار قبروں کے درمیان اکیلی زندہ وجاوید اس قبر کے کونے پر بیٹھی ہے......مگر......عافیہ یہ مجسمہ ہی تو شناخت ہے اس عظیم فنکار کی......اُس کا اس سے بڑھ کر اور کیا تعارف ہوسکتا ہے کہ وہ اس شاہ کار کا خالق ہے جس کی عجیب سی کشش مجھے یہاں کھینچ لائی۔ میں تو جانتی بھی نہ تھی کہ یہ قبرستان ہے۔ میں سمجھی شاید عجائب گھر کا......کوئی حصّہ ہوگا......عافیہ......میں بھی......تم دیکھنا اپنے مجسّموں میں زندہ رہوں گی۔ بھلے ہی کوئی میرا نام نہ جانتا ہوگا۔ سو سال بعد شاید......میرے فن پارے بھی کسی فن کے پرستار کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں گے......کوئی ایسے ہی میرے بارے میں سوچے گا......جیسے......جیسے میں:'' اس کی کانپتی ہوئی آواز گلوگیر ہوگئی۔ عافیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''چلیں......'' اس نے آہستہ سے کہا تو وہ کھڑی ہوگئی۔

اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے اس مجسّمے سے نظریں ہٹائیں اور دھیرے دھیرے چلنے

لگی۔ دو قدم چل کر ہی وہ ٹھٹکی اور ایک اور قبر کے پاس رکی جسے جاتی بار اس نے دیکھا تھا......اور اچھی طرح دیکھنا چاہ رہی تھی۔ وہ قبر کا کتبہ پڑھنے لگی۔ عافیہ نے بھی اسی کی طرح جھک کر دیکھا۔لوحِ تربت پر جہاز کے لنگر کا نشان بنا ہوا تھا۔شاید کسی جہاز ران کی قبر تھی:

IN VERY LOVING MEMORY OF MABEL ELLEN

BROADWAY

OUR DARLING MAISIE

BORN MAY 25TH 1875

FELL ASLEEP ON JUNE 9TH 1901

تم سمندر پار سے یہاں مرنے کیوں آئے تھے......اتنی کم عمر میں......

ملیحہ نے نام کے نیچے لکھی عبارت پر نظر دوڑائی۔ رومن تحریر میں پتھر پر اُبھرے ہوئے حروف:

Passing out of shadow

Into a purer light

Stepping behind the curtain

Getting a clearer sight

Passing out of the shadow

Into eternal day

Why do we call it dying

This sweet going away

سویٹ گوئنگ اوے......؟......ہاں......کیوں نہیں......ہر سوچ کے بوجھ سے

آزادی...... یا...... فرار...... یا......

وہ پھر زمین پر بیٹھ گئی۔

"عافیہ...... دیکھو تو فن کا خزانہ ہے یہ جگہ...... یہ محبت اور جدائی کے نغمے...... یہ شاندار لکھاوٹ...... دل کیسے کیسے دھڑکے ہوں گے ان حادثوں پر...... لوگوں نے کیسے کیسے سہے ہوں گے یہ المیے۔ کبھی غم سے کبھی بہادری کا مظاہرہ کر کے......"

اُس نے عافیہ کا بازو کھینچ کر اسے نیچے بٹھا دیا...... عافیہ کے سامنے سے ہٹنے سے ایک اور عبارت نظر آئی جس پہ مرنے والے کے علاوہ اُس کے اُس وقت زندہ والدین کا نام بھی کندہ تھا۔ صلیب کے نشان کے نیچے کتبے پر بیٹے کا تعارف درج تھا:

CAPTAIN MAREUS WILLIAM DELAPOER

BERESLORD

3RD BATTALION RIFLE BRIGADE

BORN MAY 6TH 1862,

DIED SRINAGAR AUGUST 8TH 1900.

قبر کی چوڑی سی سِل کے اوپر اُس کے غمزدہ والدین نے اپنے نام لکھوائے تھے:

THIS CROSS IS CREATED BY

SORROWING PARENTS

GEORAGE D. BERESLORD

MARY A. BERESLORD

انسان کیا کیا کرتا رہتا ہے...... مر جاتا ہے تو...... سب ختم...... بیرس لارڈ کبھی اپنے اڑتیس سالہ جوان کیپٹن میں اپنا مستقبل دیکھتے ہوں گے...... پھر اُس کے نام کے ساتھ اپنا

نام لکھ کر وہ بھی چل دیئے......اُف......قدم قدم پر کتنے المیے......کتنی کہانیاں۔ کتنی داستانیں......کتنے غم......ملیحہ نے قبر سے نظریں ہٹا کر اوپر چنار کی ٹہنیوں کو دیکھا۔

دیوار کی اُس طرف سے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں تو وہ دونوں اپنی جگہ سے اٹھیں۔ کسی نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ عافیہ آگے آگے اور ملیحہ اُس کے پیچھے چل رہی تھی...... پھاٹک سے نکل کر انھوں نے دیکھا کہ اس طرف کا بھی آدھا حصہ قبرستان کی ہی نئی توسیع تھا۔

انگریزی حکومت کے بعد سے ادھر اکاّ دُکاّ میّت ہی لائی جاتی تھی کہ اس فرقے کے لوگ وہاں نہ کے برابر تھے بلکہ اُس دوران بھی بہت کم۔

اس حصےّ میں ایک طرف دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور ایک تندرست نوجوان سفید براق بنیان پہنے آدھی سے زیادہ قبر کھود چکا تھا کہ اُس کی ٹانگیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس حصے میں بہت کم قبریں تھیں۔ اُن دونوں نے کبھی ایسا منظر نہ دیکھا تھا...... بھلے ہی اس ذکر سے کبھی ان میں سے کسی نے خوف محسوس کیا ہو مگر اس وقت ماحول اس قدر پر سکون سا تھا کہ وہ سارا منظر ایک حقیقت سے زیادہ اور کوئی اثر نہ رکھتا تھا......

''کس کا انتقال ہوا بھیا......'' ملیحہ نے یوں ہی دریافت کیا تھا۔

''کانوینٹ کی......ایک سینئر ٹیچر کا انتقال ہو گیا ہے......''

چوکیدار نے بتایا تھا۔

بعد میں عافیہ نے جب بھی یہ واقع دہرایا تو اپنی حیرت کا اظہار ضرور کیا کہ اُس دن وہ اُس سارے منظر سے ڈری کیوں نہ تھی...... بلکہ بہت برس بعد دوبارہ جب عافیہ کشمیر گئی تھی تو اُس علاقہ سے اُس کا پھر گزر ہوا تھا۔ جب بھی گرمیوں کا ہی موسم تھا۔

اُس وقت بھی اُس نے بالکل ویسا ہی منظر دیکھا تھا تو قریب چلی گئی تھی۔ اُس دن اُس کا شوہر ظہیر الدین بھی ساتھ تھا۔

''کس کا انتقال ہوا ہے......'' جانے اُس نے کیوں پوچھا تھا۔

''مشن اسکول کے صاحب تھے......اولڈ بوائے......غلام رسول......تبدیلی کے بعد بھی نام نہیں بدلا تھا انھوں نے۔ جہاز سے آ رہی ہے ان کی میت......وصیت کر گئے تھے کہ سرینگر کے قبرستان میں دفنایا جائے انھیں......'' بوڑھے چوکیدار کے پاس بیٹھے ایک شخص نے کہا تھا۔ چوکیدار نے مٹی کے حقے میں لگی بانس کی نے منہ سے نکال کر اثبات میں سر ہلایا تھا اور نے دوبارہ منہ میں دبالی تھی۔

اُس دن شہر کے انگریزی سکولوں میں اچانک آدھے دن کے بعد کی چھٹی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

عافیہ جب راستے میں شوہر کو کچھ برس پہلے کا ایسا ہی واقعہ سنا رہی تھی تو سامنے سے اچانک چھٹی ہو جانے سے خوش بچے، دنیا کی بے ثباتی سے بے خبر اپنی اپنی معصومیت میں الجھے اپنی اپنی منزلوں کی طرف جا رہے تھے۔

مجسمے کو دیکھ آنے کے بعد اُس رات جب ملیحہ سونے کے لیے لیٹی تھی تو عافیہ نے محسوس کیا تھا وہ اپنے بستر میں چھپی چپکے چپکے رو رہی تھی۔ عافیہ نے ہاتھ بڑھا کر درمیانی تپائی پر رکھا ٹیبل لیمپ آن کیا......اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیوں......رو رہی ہو......'' اُس نے پتلی سی ریشمی رضائی میں چھپا ملیحہ کا شانا ہلایا......تو ملیحہ نے رضائی میں ناک تک چھپا ہوا اپنا چہرہ باہر نکالا۔

''گھر والے شادی کرانے پر بضد ہیں۔ شاید آگے پڑھنے تک نہ دیں......اور میرا شوق......؟'' وہ رو چکی تھی۔ آہستہ سے بولی ''جانے کون لوگ ہوں گے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا......پریشان کیوں ہوتی ہو......'' عافیہ نے روایتی سی تسلی دیتے ہوئے سوچا تھا کہ شاید سچ مچ سب کچھ ٹھیک ہوگا......مگر اُس کے بعد سب کچھ خراب

ہو گیا تھا۔

یہ باتیں عافیہ نے بہت پہلے بھی سنائی تھیں فیصل کو...... کچھ علم اسے ملیحہ سے مل کر ہوا تھا۔ کچھ اس نے خود تصور میں دیکھ لیا تھا۔

وہ صبح صبح اپنے بستر پر دراز سوچ رہا تھا۔

اصغر علی...... تمہاری لاپروائیوں سے حسن کا یہ مجسمہ...... فن کی یہ سرتاپا مورت ٹوٹ نہ جائے...... اصغر علی...... پیدائشی چغد!

اُس کی آنکھوں میں اکبر علی کی بڑے سے نگ والی انگوٹھی گھوم گئی۔

اگر یہ مرگئی تو تم Mabel Emil کے جیسا اس کا مجسمہ بنواؤ گے؟۔تم تو ایک قد آدم تصویر نہ بنواؤ اس کی...... چغد کہیں کے...... نیلم پہنتا ہے...... اور ہیرے کو نہیں پہچانتا۔

''......اصغر علی......'' اُس نے اونچی آواز میں ہنستے ہوئے دانت پیس کر کہا اور بستر سے اچھل کر فرش پر کودا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

پچھلے پیر سے اس جمعے تک ملیحہ سے رابطہ ہی نہ ہوا تھا کہ وہ کام میں بے حد مصروف رہا۔ نہ ہی ملیحہ نے کوئی فون کیا تھا۔ اگلے پیر کو وہ ملیحہ کے وہاں رات کے کھانے پر مدعو تھا۔ آج شام میں مصروفیت کچھ کم تھی اُس نے فون کیا۔

''ہیلو......'' ملیحہ کی اُداس آواز بمشکل نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''کیا ہوا......؟؟'' وہ تشویش سے بولا۔

''کیسے ہو......تم؟''

''آپ اس قدر اُداس کیوں ہیں......؟''

''اداسی میرے ساتھ......ہی رہتی ہے......'' اُس نے مزید اداسی سے کہا۔

''میں......آجاؤں......؟''

''تمہارے آنے سے...... اداسی ختم ہو جائے گی کیا......؟''

''میں ختم کر دوں گا اداسی آپ کی...... پھر...... کوشش تو کر ہی سکتا ہوں نا......''

وہ خاموش رہی۔

''آ جاؤں کیا...... بولیے نا...... پلیز......؟''

''اچھا...... ٹھیک ہے...... جب آنا چاہتے ہو...... تو......''

اُس کی آمد کی اطلاع پر ملیحہ ڈرائنگ روم میں آئی۔ فیصل اسے دیکھ کر سلام کرنا بھول گیا۔ ملیحہ بہت نحیف نظر آ رہی تھی۔ اُس کے ماتھے کی داہنی جانب ضرب کی شکل میں روئی کے چھوٹے سے پھائے پر بینڈ ایڈ چپکی تھی۔

''یہ کیا ہو گیا...... آپ کو......؟''

''بیٹھو...... چائے کے لیے...... کہتی ہوں......'' ملیحہ کا سانس بے ترتیب سا چل رہا تھا آنکھیں پوری طرح وا نہیں ہو رہی تھی۔

''نہیں...... میں کہتا ہوں چائے کے لیے...... آپ پلیز بیٹھیے......''

وہ کھڑا رہا...... ملیحہ بیٹھی تو وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا...... پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کو نیند آ رہی ہے...... آرام کریں گی نا'' وہ کئی لمحے مسلسل ملیحہ کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

''نہیں...... بہت دن سے...... آرام ہی کر رہی ہوں۔'' ملیحہ نے بشاشت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

''کیا نیند کی...... گولیاں؟''

''نہیں...... اُس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کچھ ایسی...... میں زیادہ چوٹ لگنے کے بعد...... غنودگی کے سے عالم میں...... رہتی ہوں...... کئی روز تک......''

''یعنی؟ مطلب...... رہتی ہیں...... واقعی کیا...... کیا چوٹ لگانا سچ مچ آپ کا مشغلہ ہے......؟...... یوں کوئی...... ایسی حالت بنادیتا ہے کوئی اپنی...... بالکل زرد ہوگیا ہے چہرہ آپ کا......''فیصل کی آواز میں رنج شامل ہوگیا تھا۔

دیوار کی گھڑی نے سنگیت چھیڑ دیا اور ساتھ ہی دروازے کی گھنٹی بجی۔ لمبی لمبی تین گھنٹیاں بلکہ آخری گھنٹی پہلی دو گھنٹیوں سے زیادہ لمبی۔ ملیحہ نے تھکی تھکی گردن کھڑکی کی طرف گھمائی جو سامنے کے برآمدے میں کھلتی تھی اور پھاٹک کی سیدھ میں تھی۔

اکبر علی اندر داخل ہوئے، ان کے بھورے رنگ کے سوٹ پر لمبی کالی دھاریاں تھیں اور سفید رنگ کی قمیض پر زرد ٹائی تھی جس پر یورپ کے کسی ملک کے پرچم کا ڈیزائن تھا۔ کوٹ کی اوپری جیب میں سے چشمے کے سنہرے قلم نما فریم کا اوپری حصّہ جھانک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی انگلیوں والے ہاتھ میں چھوٹا سا روپہلا موبائل فون تھا۔

''السلام علیکم......''فیصل نے نشست سے اٹھ کر ان کا جائزہ لیا۔

''وعلیکم۔ کہاں رہتے ہو بھائی......؟''وہ اس کے سامنے تین نشست والے صوفے کے عین درمیان میں گھٹنے دور دور کر کے بیٹھ گئے اور ٹائی ڈھیلی کرنے لگے۔

''بہت سخت گرمی پڑ رہی ہے باہر...... اندر اے۔ سی میں کسی کو کیا ہوگا احساس...... گرمی کا......''انھوں نے کنکھیوں سے بیوی کو دیکھا اور چہرہ فیصل کی طرف کیے بیوی کی طرف وہ ہاتھ بڑھادیا جس میں انھوں نے ٹائی تھام رکھی تھی۔ ملیحہ نے چپکے سے ٹائی لے کر صوفے کے بازو پر رکھ دی۔

تمھیں...... کس نے کہا تھا...... اصغر علی...... اس گرمی میں سوٹ ٹائی پہن کر جانے کے لیے کس نے کہا تھا...... احمق کہیں کے......

فیصل نے اپنے آپ کو کہتے سنا تو پل بھر کے لیے ملیحہ کی طرف اُبھرتا ہوا فکرمندی کا

احساس بھول کر مسکرا دیا۔

''انھیں دیکھئے......'' اکبر علی نے چہرہ فیصل کی طرف کیے ہوئے ایک بار پھر ملیحہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''انھیں بار بار دورے پڑتے ہیں۔ کس چیز کی کمی ہے۔ ان کو ہر چیز میسّر ہے...... پھر بھی پتھروں سے سر پھوڑتی رہتی ہیں......اور......''

'' چُپ ہو جایئے......'' وہ دفعتاً چیخی۔

'' چُپ کیجئے آپ...... میری بات...... مت کیجئے...... میں ...... میں......''

وہ کھڑی ہوگئی۔ اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ سانس بری طرح پھولنے لگ گیا تھا۔

''دیکھو...... دیکھ رہے ہو...... یہ ہے اصلیت ان کی...... خود کو فنکار سمجھتی ہیں...... دُنیا کی سب سے بڑی فنکار شاید...... صدا بہار حسینہ سمجھتی ہیں...... کیوں نہیں بھائی...... ان کو تو خدا نے ہر فکر سے آزاد رکھا ہے نا...... انسان بوڑھا ہوتا ہے ذمہ داریوں سے...... ان پر کوئی ذمہ داری ہی نہیں......'' اکبر علی نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ اور اطمینان سے آہستہ آہستہ چائے کی پیالی میں چمچہ چلاتے رہے۔

''یہ ہے اس دیوانی عورت کی اصلی صورت۔ پاگل عو......''

''میں پاگل نہیں ہوں......'' وہ زور سے چیخی۔

''نہیں ہوں میں پاگل...... سمجھے آپ......'' پھر دھیرے سے صوفے پر ٹک گئی اور سسک سسک کر رو پڑی۔

''تو...... پھر کیا ہیں...... آپ؟'' اکبر علی نے آرام سے منہ ملیحہ کی طرف موڑا...... وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی۔

فیصل کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔

یہ اصغر علی کا بچہ...... کہیں سچ مچ ہی پاگل نہ کر دے گا اسے...... خدا نہ کرے۔

کیسے ہو جاتے ہیں......لوگ پاگل ہو کر......

اُسے اچانک خیال آیا تھا۔

عافیہ کے حکم سے اُسے پاگل خانے کا منظر کچھ دن پہلے ہی دیکھنا پڑا تھا۔

ایک پاگل نے وہاں موجود محافظ کے ہاتھ میں پکڑی بریانی کی رکابی پر زور سے ہاتھ مار کر گرا دیا تھا۔ گرم گرم بریانی سے جلا ہاتھ وہ ہوا میں لہراتا رہا اور زور زور سے ہنستا رہا۔ مارے ہنسی کے اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ اپنی دھاری دار قمیض سے ناک اور آنکھیں پونچھتا رہا۔ دوسرا مریض کافی دیر سے دیوار کی طرف منہ کیے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا، قہقہے سن کر بری طرح چیخا، اور کسی غیر مانوس زبان میں بولتا ہوا، غراہٹ نما انداز میں جیسے کہ اسے دھمکی دینے لگا۔ وہ کوئی ایک منٹ بغیر رکے بولتا گیا اور پھر دوبارہ سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا۔ مگر جب قہقہے مسلسل اس کی سماعت سے ٹکراتے رہے تو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ غصے کے مارے اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔ وہ پہلے مریض کو پکڑنے کے لیے لپکا۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر پہلے مریض نے بھاگنا شروع کر دیا۔ دوسرا جو بھاری تن و توش کا تھا، اپنے دونوں پہلوؤں پر ہاتھ دھرے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ مارے غصے کے انگارہ ہو رہا تھا۔ پہلا مریض بھاگتے بھاگتے رک گیا اور پلٹ کر اسے دیکھا۔ اسے ایک جگہ ایستادہ دیکھ کر اس کی طرف دوڑا اور قریب پہنچ کر قہقہہ لگایا۔ وہ واپس پلٹا ہی تھا کہ دوسرے نے اُسے بھاگ کر جا لیا اور اسے پکے فرش پر اوندھا گرا کر اُس کے کولہوں پر چڑھ بیٹھا۔ پھر تب تک اس کے گھونسے مارتا رہا جب تک چار محافظ آہستہ خرامی سے آئے اور اسے پکڑ کر زنجیروں سے باندھ دیا۔ گرا ہوا مریض سر دائیں بائیں ہلا ہلا کر اونچی آواز میں روتا رہا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جسے وہ پونچھ ہی رہا تھا اور نہ اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ باقی مریض ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ کوئی فیصل کی لائی ہوئی بریانی کھا رہا تھا، کوئی بریانی کو اپنی قمیض کی جیب

میں ٹھونس رہا تھا۔ کھانا تقسیم کرنے والا خدمتگار انھیں بار بار ڈانٹ رہا تھا۔

''آرام سے یار......'' فیصل نے خدمتگار سے کہا تھا۔

''ارے نہیں صاحب...... یہ آرام سے تو کبھی بات مانتے ہیں نہیں...... کوئی کئی کئی بار کھاتا ہے...... اور کوئی کھاتا ہی نہیں...... وہ...... وہ دیکھ رہے ہیں...... اُدھر آپ...... وہ جو کونے میں بیٹھا اِدھر دیکھ رہا ہے...... دیکھئے کب سے بلا رہا ہوں...... ابے ادھر آ سالے۔''

اُس نے گہری سانولی رنگت کے گھنگھریالے بالوں والے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ...... پچھلے پندرہ سال سے ہے...... اسی جگہ...... دو سال پہلے...... میں نے اسے تیرہ برس بعد بولتے دیکھا تھا...... ایک ڈاکٹر صاحب نئے آئے تھے۔ تمل جانتے تھے۔ انھوں نے بات کی تو بولا تھا۔ ورنہ ہم سب اسے گونگا سمجھتے تھے۔''

''ہوا...... کیا ہے اسے؟'' فیصل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں صاحب...... آیا تھا تو بالکل جوان تھا...... ہٹا کٹا...... مگر کھانے پینے میں کوئی دلچسپی نہیں اس کی...... دیکھئے نا...... ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گیا ہے......''

فرش پر گرے ہوئے مریض کو مرہم پٹّی کے لیے لے جایا گیا۔

''مگر...... یہ...... اس طرح تو...... یہ بے چارے۔'' فیصل نے فرش پر پھیلے خون کو دیکھا۔

''وہ اُدھر مرمّت کا کام چل رہا ہے نا۔ لڑاکے خطرناک پاگل تو ادھر ہیں۔ ان میں جو کچھ بہتر تھے، فی الحال ادھر لائے گئے ہیں۔ ورنہ یہ زیادہ تر پُرسکون رہنے والے پاگل ہیں۔''

اس نے ایک نوجوان مریض کو کھانا پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تم نے...... میرا Application پوسٹ کر دیا نا۔'' لڑکے نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں...... اور کیا...... وہیں سے تو آ رہا ہوں۔'' خدمتگار بھی مسکرایا۔

''او...... تھینک یو......'' لڑکے نے کھانے کی رکابی والا ہاتھ جالی سے اندر کھینچ لیا اور

دُور دیوار سے لگ کر کھانا کھانے لگا۔

''یہ...... نیا نمونہ ہے...... جب ملتا ہے یہ ہی سوال کرتا ہے اور جواب سے مطمئن بھی ہو جاتا ہے...... پاگل کہیں کا۔''

''بالکل...... نارمل لگتا ہے یہ تو......'' فیصل آہستہ سے بولا۔

''ایسے ہی ہیں یہ...... ہمیں پاگل کر دیں یہ تو...... وہ دیکھئے...... وہ خود کو منتری کہتا ہے...... ابے ادھر آ......'' خدمتگار نے فرش پر بیٹھے ایک درمیانہ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ قریب آ گیا اور مسکرا کر ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

''میں...... آپ کا سیوک ہوں...... اب کے سب مسئلے ٹھیک کر دوں گا...... سارے مکان پکے ہوں گے تم لوگوں کے...... نیا پل بھی بنوا دوں گا...... شہر والی سڑک اتنی چوڑی کروا دوں گا......'' اُس نے دونوں بانہیں پھیلا دیں......

''پہلے کھا...... صاحب بریانی لائے ہیں...... تیرے لیے۔''

''دھنیہ واد......'' اُس نے دوبارہ ہاتھ جوڑ کر مسکرا کر سر ہلایا۔

''وہ دیکھئے...... وہ سر پر پائجامہ باندھے...... جو آ رہا ہے نا...... یہ اپنی طرف سے سہرا باندھے ہوئے ہے......'' خدمتگار نے اپنی طرف آ رہے ایک دُبلے لمبے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس نے پائجامے سے ناک تک چہرہ چھپا رکھا تھا اور قمیض کے نیچے سے اُس کا میلا سا زیر جامہ نظر آ رہا تھا۔

''چلو بھائی...... چلو...... کدھر ہے میری گھوڑی......'' اُس نے بڑی عجلت سے دریافت کیا اور کوئی جواب سنے بغیر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور منھ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔

''ارے چُپ...... چُپ کر......'' خدمتگار اُونچی آواز میں بولا۔

''سگریٹ...... کون...... پیئے گا......'' خدمتگار نے نعرہ لگایا۔ تقریباً سب ہی خوشی سے چلاّئے ''ہم پیئیں گے۔'' 'دولہا' بھی فوراً آنسو پونچھ کر مسکرانے لگا۔

''لائن میں......رہو......ورنہ کسی کو نہیں ملے گا۔''

چارپائی پر بیٹھے ایک عمر رسیدہ دیوانے نے اونچی آواز میں کہا۔

''نہیں......ایسے نہیں......تم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھو......میں ایک ایک کر کے بلاؤں گا......'' خدمتگار بولا اور وہ سب چھوٹے بچوں کی طرح اپنے اپنے بستروں پر جا بیٹھے۔ جو دو سگریٹ نہیں پیتے تھے، وہ اپنی دنیا میں ویسے ہی گم رہے جیسے کچھ دیر پہلے تھے۔

فیصل نہایت رنجیدگی سے ان کی حرکات دیکھتا رہا۔ کتنی بے قاعدگی تھی۔ نظامت میں۔ پھر وہ دوسری طرف گیا۔ خدمت گار ساتھ ہولیا۔

''صاحب ان لوگوں کے لیے کھانا لائے ہیں......'' خدمتگار نے مریضاؤں کی خاتون خدمتگار سے کہا۔

اُس حصے کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ بلکہ شاید اس سے بھی بُرا...... گھنے، چھوٹے، میلے بالوں والی ایک نوجوان عورت کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔

''اپنے پتی کو......پتر لکھتی ہے یہ......روز......'' خدمتگار ہنس کر بولا۔

''او......Realy تو......'' فیصل نے حیرت سے کچھ پوچھنا چاہا۔

''تو کیا......پاس جا کر......دیکھیں گے تو......'' وہ زور سے ہنسا۔

''تو نہ اُس Pen میں Ink ہے......اور نہ......اس گتّے کے اندر کاغذ......مگر ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہے اسے......جب کبھی کوئی دوسری لڑکی اس سے یہ ٹوٹا ہوا پین چھیننے کی کوشش کرتی ہے تو......خوب سر پھٹول ہوتی ہے۔ باپ رے باپ!''

''اس کا پتی ہے کیا......؟''

''ہاں......بدیس گیا تھا......آیا ہی نہیں......دوسرا بیاہ کر لیا ہے وہاں......'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولا تو وہ زخمی شیرنی کی طرح بھاگ کر سلاخوں کے پاس آئی اور غصے سے اُسے

گھورنے لگی۔

"Will you just shut up, you son of a bitch." وہ دانت پیس کر بولی اور سڈول بانہیں اوپر اٹھا کر اپنے بکھرے بالوں کو جوڑے کی صورت گھمانے کی کوشش کرتی ہوئی ننگے پاؤں سیمنٹ کے فرش پر پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

''دیکھا صاحب...... انگریزی میں گالی دیتی ہے...... سالی...... پاگل۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔

''وہ دیکھئے...... یہ بھی ایک نمونہ ہے۔''

خدمتگار نے ایک جواں سال لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کا وزن سنبھالنے کی کوشش کرتی پاؤں دُور دُور رکھتی قریب آ رہی تھی۔

''اوئے...... حرام جادے...... دو جنوں کا کھانا دے نا مجھے...... نہیں تو...... یہ تیرا بچہ جو اُٹھائے پھرتی ہوں...... مر جائے گا۔'' اُس نے پاس پہنچ کر زمین پر تھوک دیا۔

'' جھُوٹ بولتی ہے...... بے شرم...... جانے کس کا ہے...... اور......''

''کس کا......؟ کس کا ہے کے بچّے...... شام کو بجلی بجھانے کے بعد تُو ہی تو آیا تھا میرے پاس...... تیری ڈیوٹی تھی...... یہ تیری حرام کھا کھا کر بڑھی ہوئی توند سب لڑکیاں پہچانتی ہیں...... تیرے پاس سے مرے ہوئے چوہے کی سڑاند آتی ہے...... تھو...... آخ تھو......'' پھر وہ فیصل کی طرف مُڑی۔

''میں پاگل نہیں ہوں...... صاب جی...... چچا نے یہاں بند کروا دیا ہے مجھے...... وہ سب بہت مارتے تھے مجھے...... میں نیند میں ڈر کر جاگ جاتی تھی۔ چیخ کر بھاگ نکلتی تھی گھر سے...... وہ میرا گھر تھا۔ میرا گھر چھین لیا...... میرے باپو نے اس چچا کو بیٹے کی طرح پالا تھا...... باپو مر گئے تو...... وہ...... بہت ظالم لوگ ہیں......'' وہ خالی خالی سی آنکھوں سے دوسری طرف دیکھنے لگی مگر اگلے ہی لمحے خدمتگار کی طرف پلٹی۔

''اور...... یہ درندے...... یہ جانور...... ہمیں جانور سمجھتے ہیں...... یہ خود ہی تو...... یہ سب ایک جیسے ہیں...... بہت کم لوگ ہیں اچھے...... یہاں پر......''

فیصل اُس رات سو نہیں پایا تھا۔ بھابھی نے کہا تھا۔ یتیم خانے اور پاگل خانے کے مکینوں کو کھانا کھلانے کے لیے...... اور کیا کیا ہو رہا ہوگا۔ اس دنیا میں...... انسانوں کی رہائش...... پنجروں میں...... یہ ناروا سلوک...... گھر والے ان کو لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شاید بھول جاتے ہیں۔ اپنے عزیزوں کو۔ انسان کی نفسیات بھی عجیب ہے۔

فیصل کے ذہن میں کچھ دیر کے لیے دماغی ہسپتال کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔

یہ سلوک کرتا ہے یہ بے حس انسان۔ اس فنکارہ کے ساتھ...... یہ سر کی چوٹیں...... یہ کمزوری...... یہ حالت......

فیصل سوچتے سوچتے کبھی ملیحہ کو دیکھتا کبھی اکبر علی کو۔

''جانتے ہو؟...... یہ حالت ان کی......'' اکبر علی نے کچھ کہنا شروع کیا تھا۔

''رہنے دیجیے نا......'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''اکبر بھائی......'' وہ کچھ رک کر بولا۔ ''انھیں آرام کی ضرورت ہے......'' فیصل کا دل اسے بھائی کہنے کو ہرگز نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے ملیحہ کی طرف دیکھا۔ ملیحہ نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے تھے اور فیصل کو دیکھ رہی تھی۔ فیصل نے ایسا کرب ناک حسن پہلے نہیں دیکھا تھا۔

اُس کا جی چاہا کہ کنول کی پتیوں ایسے رخساروں پر ٹکے ان آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے پونچھ لے اور اس کا سر اپنے شانے سے لگا کر بال سہلا سہلا کر اسے چپ کرائے...... یا کم سے کم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کے کمرے تک چھوڑ آئے۔

''آپ اندر جا کر کچھ Rest لے لیجیے......'' فیصل نے ملیحہ کی آنکھوں میں دیکھ

کر کہا۔ وہ اپنے آپ کو بے بس سا محسوس کر رہا تھا۔

''پلیز......'' وہ سراپا التجا بن گیا۔ ملیحہ نے اسے بغور دیکھا۔ صرف ایک پل کے لیے۔ وہ بھی بے اعتباری سے کہ اس نے اِس سے پہلے اپنے لیے کسی کے چہرے پر ایسے اپنائیت بھرے تاثرات نہیں دیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں مزید بھر آئیں۔ وہ ہونٹ بھینچے اسے دیکھتی رہی۔ آنسو پی جانے کی بسیار کوشش کے باوجود آنسو ڈھلکتے رہے۔ اکبر علی سر جھکائے اپنے لیے چائے بناتے رہے۔

اس شام وہاں سے لوٹنے کے بعد فیصل ملیحہ کے ہی بارے میں سوچتا رہا۔ دوسرے دن دس ایک بجے اس نے ملیحہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تو معلوم ہوا وہ جب سے سو رہی ہے۔ اکبر علی اپنے دفتر کے لیے نکل چکے ہیں۔ فیصل نے ملازم سے کہا کہ ملیحہ سے کہے فیصل فون پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ ملازم کو فیصل کی گھر کے فرد جیسی اہمیت کا احساس تھا۔ اسی لیے بیگم صاحبہ کو جگانے کے لیے دروازے پر دستک دیتے وقت اُس نے زیادہ نہیں سوچا۔ ملیحہ نے اندر سے فون اُٹھالیا۔

''کیسی ہے طبیعت...... معافی چاہتا ہوں...... جگا دیا آپ کو......''

''نہیں...... اچھا کیا...... اب اور کتنا سوتی...... نیند جانے کیسی ہے...... نیند بھی نہیں ہے......اور جاگ بھی نہیں رہی......''

''آپ میری ایک بات مانیں گی......؟''

''بولو۔''

''آپ ڈاکٹر کو فون کر کے بلوا لیں......اپنا بلڈ پریشر چیک کروا لیں......''

''زیادہ نہیں ہے میرا بی پی شاید......'' آواز میں تھکن قدرے کم تھی۔

''رہتا ہے کیا......؟''

کبھی کبھی......Fluctuate کرتا ہے اصل میں......''

''اس وقت کرا لیجئے نا چیک......پلیز......''

''ملیحہ کی آنکھوں میں گذشتہ شام کا اُس کا التجا بھرا چہرہ گھوم گیا۔

''تم فکر نہ کرو......میں ٹھیک ہوں......'' وہ آہستہ سے بولی۔

''کیوں نہ کروں......آپ......'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

ملیحہ کچھ نہ بولی۔ کئی لمحے یوں ہی خاموشی میں گزر گئے۔

''کیوں کرو گے......تم......میری فکر؟'' وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

''کروں گا......میں......بس'' فیصل کی آواز بھاری ہوگئی۔ اور ملیحہ کی ہچکی سنائی دی۔

''آپ ایسا نہیں کریں گی......نہیں کریں گی آپ ایسا......سمجھیں آپ؟

خود کو برباد کرنے کا......اس طرح......اس طرح آپ کو......کوئی حق نہیں۔ آپ فن کی امانت ہیں......فن شناسوں کے لیے......آپ ایسا نہیں کریں گی......'' اُس کا لہجہ مضبوط تھا۔ کچھ سیکنڈ خاموشی سے گزر گئے۔

''اور......میں......میں آپ کے فن کا قدردان ہوں......'' اُس نے مسکراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سُن لیا آپ نے جناب۔'' وہ ہلکے سے ہنسا۔

''جی......ہاں......سن لیا......'' وہ کچھ پرسکون سی معلوم ہوئی۔

''کوئی......ثبوت......'' اس کی آواز میں ہلکی سی کھنک شامل ہوگئی۔

کچھ ویسی ہی جسے پہلے پہل سن کر فیصل سحر زدہ ہو گیا تھا۔

''وقت آنے پر......ثبوت بھی مہیا کروں گا......می لارڈ......'' وہ ہنسا تو ملیحہ بھی کمزوری ہنسی ہنس دی۔

فیصل جب کسی بات پر سوچ سوچ کر تھک جاتا اور کوئی حل تلاش نہ کر پاتا تو پریشانی سے

بچنے کے لیے کچھ اور کرنے کی کوشش کرتا۔ کبھی لمبے ڈرائیو پر جاتا۔ کبھی میلوں پیدل چلتا رہتا۔ یا کسی نئے ریستوران میں کھانا کھانے چلا جاتا۔ اُسے اچانک پرانے شہر کا خیال آیا...... عافیہ بھابھی نے ایک چیز نہاری بتائی تھی جو پرانی دلّی میں بہت لذیذ بنتی ہے۔

بڑے جانور کی ران کے بے ریشہ گوشت ادلے کی گاڑھی گاڑھی نہاری جو ساری رات مدھم آنچ پر مصالحوں میں پکتی ہے...... نہار منہ کھائی جانے والی نہاری...... یہ چائے وائے تو فرنگیوں کی دین ہے......

اصغر علی......!

اس نے خاصی اونچی آواز میں پکار کر کہا۔

اصغر علی...... خبیث...... آج تیرا دیا غم...... ہم نہاری کھا کر غلط کریں گے...... اُس نے بہ آوازِ بلند کہا اور مسکرا دیا...... پھر مگر اسے دفعتاً یہ خیال آیا کہ اگر ملیحہ اس کے ساتھ چلے گی تو کتنا خوش ہوگی۔ نئی دلّی کے ڈیفینس کالونی میں پیدا ہوئی...... وسنت کنج کے علاقے میں بیاہی وہ لڑکی۔ عافیہ بھابھی کی پرانی دلّی دیکھ کر کچھ دیر کو سارے غم بھول جائے گی کہ ایک بار بہت پہلے وہ عافیہ بھابھی کے ساتھ آئی تھی تو اُس نے وہاں کا مخصوص، محفوظ کلچر خود سے بہت قریب محسوس کیا تھا...... آج اگر فیصل کے ساتھ آئے گی تو وہ اسے اس کی پسند کی ہر چیز دکھائے گا۔

بڑی بڑی آہنی کیلیں جڑے ایک کٹرے کو دوسرے کٹرے سے الگ کرتے ہوئے بلند و بالا چوبی پھاٹک دیکھ کر سوچوں میں گم ہو جائے گی۔ وہ اسے بتائے گا کہ آج کل بسائی گئی مختلف سوسائیٹیز کی طرح پہلے بھی لوگ اپنی سماجی اور اقتصادی صورتِ حال کے مطابق الگ الگ بستیاں بسائے ہوئے تھے اور یہ بستی کٹرا کہلاتی تھی...... اور اب بھی کہلاتی ہے۔ جیسے کٹرا نیل، کٹرا علی رضا وغیرہ۔ اور قدیم نام بھی وہی ہیں...... جیسے غالب کی گلی قاسم جان یا بارہ پھاٹک والی بارہ دری شیر افگن خاں...... یا پھر...... یا پھر ہمدرد کا سو سال پُرانا دواخانہ......

یا…… (کرتار سنگھ نے…… اتنا ہی بتایا تھا اُسے)۔

ہاں اُس کے بعد ملیحہ کو جامع مسجد کے سامنے گھومتے بہشتی کے مشکیزے سے پانی پلا کر حلیم اور بریانی کھلائے گا۔ (یہ کیا Combination ہے یار) کہ سب لوگ کھاتے ہیں…… اُدھر…… ایسے…… ہاں…… پھر…… پھر……

پھر مینا بازار سے اُسے پیازی رنگ کی ساڑھی اور اسی رنگ کی چوڑیاں لے دے گا…… پھر اسے گردوارہ سیس گنج کے قریب واقع صدی بھر پرانے گھنٹہ حلوائی سے رس ملائی کھلوا کر……

جی ہاں…… فیصل میاں…… اور کوئی کام نہیں ہے ملیحہ کو……

یہ…… یہ کس احمق کی آواز تھی……؟…… وہ مسکرایا…… ہاں…… محکمۂ آثار قدیمہ نے فی الحال ستائیس کے قریب قدیم عمارتیں اپنی تحویل میں لے لی ہیں (کرتار بھائی نے کہا تھا)۔

کسی محراب کسی چلمن کو دیکھتی ہوئی سنگ تراشی کے نمونوں کی داد دیتی ہوئی ملیحہ سارے غم بھول کر لوٹے گی تو اُس کی ہنسی کس قدر لبھاونی ہوگی…… اور جس دن چاندنی چوک کو پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے پرانے انداز میں سجایا جائے گا…… اُس دن اُس…… اُس اصغر علی کو…… افیم کھلا کر سلا دوں گا……

اور پھر ملیحہ کو اس کے کھردرے پنجوں سے آزاد کر کے میلے کی سیر کراؤں گا۔ مگر اُس کا نام ملیحہ کیوں ہے۔ وہ تو…… کتنی صاف رنگت ہے اُس کی…… خیر…… جو بھی ہے…… اُسے خوش ہونے کا پورا پورا حق ہے۔

میں سارے دُکھ بھلا دوں گا اُسے اُس کے۔

اس کی آنکھ کبھی نم نہ ہونے دوں گا……

ورنہ…… ورنہ…… وہ…… اصغر علی اسے کسی دن پاگل خانے چھوڑ آئے گا……

اور......ایک عظیم فن کارہ کو ضائع......نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہیں ہونے دوں گا ایسا۔

بس......یہی وجہ ہے......نا......؟

فیصل نے سر جھٹکا۔

ہاں......

یا اس سے الگ کوئی اور......اور......

اس نے ہاتھوں سے بال سنوارے۔

وہ عجب بے خبری کے عالم میں جانے کہاں کہاں پھر رہا تھا۔

سامنے پڑی نہاری پر ایک سوکھی پرت بیٹھ گئی تھی۔

''اور کچھ......لاؤں صاحب......؟''

کریم ہوٹل کے گول کالر کی لمبی قمیض اور پائنچوں والی سلوار پہنے بیرے نے مؤدبانہ پوچھا تو فیصل نے اپنی نہاری کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''ایک گرم گرم نہاری لے آؤ......فوراً''

ہاں......تو میں کہاں تھا؟......چاندنی چوک میں......تو......گذشتہ برس کی طرح......

برسوں بعد جیسے سجایا گیا تھا چاندنی چوک کو......چاندنی کی طرح......

جب سارا علاقہ پرانے انداز سے سجا کر جدید طرز کی روشنیوں سے نکھار دیا گیا تھا۔ ہر گوشہ جھل مل کر رہا تھا۔ جس کی خاطر پہلے ہی ہر گھر کے برآمدے کو گلابی رنگ دیا گیا تھا۔ ریشمی کپڑے کے بڑے بڑے بینروں پر ہر مقام کی تاریخی حیثیت درج کی گئی تھی۔ فن کار ایک طرف رامائن سٹیج کر رہے تھے تو دوسری جانب میرؔ، غالبؔ، داغؔ بنے گھوم رہے تھے۔ مشاعرے ہو رہے تھے۔ قوالیاں گائی جا رہی تھیں۔ لمبی سی سفید چادر بچھا کر جیسے کہ نہر نکال دی گئی تھی۔ ان گنت سٹال لگائے گئے تھے۔ ملبوسات کے۔ آرائش کے سامان

''دروازہ کھولیے نا...... میں فیصل ہوں...... بہت دیر سے کھڑا ہوں۔''

اُس نے رک رک کر جملہ پورا کیا۔

''پلیز...... کھول دیجیے دروازہ......'' وہ اُداس ہو کر بولا۔

''میں...... پریشان ہو رہا ہوں...... آپ ٹھیک تو ہیں نا۔'' مزید کچھ دیر خاموشی چھائی رہی...... پھر اندر کچھ آہٹ ہوئی...... اور دروازہ کھل گیا...... وہ دروازے پر دونوں بانہیں ٹکائے کھڑی ہو گئی۔

''کیوں...... آئے ہو تم یہاں...... کیا چاہئے تمھیں...... چلے جاؤ...... یہاں سے۔ دخل مت دو میری زندگی میں...... میرے حال پر چھوڑ دو مجھ کو......''

وہ پریشان سی ہو کر بولی...... اور پھر رو پڑی، وہ بے حد نڈھال لگ رہی تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ دروازے پر سے ہٹ کر اُس کے جسم سے لگ گیا۔ اور وہ خود دروازے کی چوکھٹ سے لگ گئی۔ اس کے ماتھے کے عین درمیان مانگ کے قریب چھوٹے سے زخم پر خون کی لکیر جم گئی تھی۔ کچھ خون بائیں ابرو تک بہہ گیا تھا اور پھر کان کے پاس سے ہو کر اُس کے گریبان تک چلا گیا تھا۔ اُس نے سیاہ رنگ کا کرتا پہن رکھا تھا، اس لیے فیصل کو اور کوئی دھبہ نظر نہ آیا۔

''آپ بیٹھیں تو...... میں بتاتا ہوں...... آپ جیسا کہیں گی وہی کروں گا...... پریشان نہیں ہونے دوں گا آپ کو......'' وہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

ملیحہ کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ آنکھوں کے گرد کی جلد سُرخ ہو گئی تھی۔ وہ ماتھے پر سلوٹیں ڈالے اُسے دیکھتی رہی۔

''کیوں...... تم...... کیوں اپنے آپ کو الجھاتے ہو...... یہ سب برسوں سے...... ایسے ہی چلتا آ رہا ہے...... ایسے ہی...... چلتا...... رہے گا......''

''میں خود کو کہاں الجھا رہا ہوں...... میں تو آپ کی بے جا قسم کی الجھنیں سلجھانے کی

''میں آپ کو...... ڈھیروں خوشیاں......'' وہ روٹھی سی آواز میں بولا۔

''بند کرو اپنی یہ بکواس فیصل...... کچھ عقل کا استعمال نہیں کر سکتے...... تو یہاں سے چلے جاؤ......'' وہ بے چارگی سے بولی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے...... چلا جاتا ہوں...... مگر...... آپ......'' اُس کی آواز رندھ گئی۔

''میں...... تم سے بہت بڑی ہوں...... اپنا گھر ہے میرا ایک...... کسی کی بیوی ہوں۔''

وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''میں آپ سے بڑا ہوں...... میں عمر کے فرق کو نہیں مانتا...... میرا سہارا چاہئے آپ کو کہ آپ اپنے فن کی معراج کو چھولیں...... پُرسکون ذہن سے تخلیق کریں...... پھر...... پھر...... شادی کر لینے سے کوئی کسی کی ملکیت نہیں ہو جاتا...... بیوی کی عزّت ہوتی ہے شوہر کی نظروں میں...... اور رہا گھر...... تو گھر انسان کو سکون بخشتا ہے، سکون چھینتا نہیں...... سکون چھین چھین کر...... آپ...... آپ......'' اس کی آواز کچھ اونچی ہو گئی۔

''آپ نے ایک بے حس انسان کے ساتھ رہ کر خود پر اور اپنے فن پر جو ظلم ڈھایا ہے...... اُس کے لیے آپ کو خدا بھی نہیں بخشے گا...... ظلم کرنا اور ظلم سہنا...... دونوں گناہ ہیں...... جانتا ہوں میں...... یہ روز روز کی چوٹیں کیسے لگتی ہیں آپ کو...... آپ......'' آواز سن کر برسوں پرانا ملازم غفور اوپری زینے تک آیا...... اور واپس چلا گیا۔

''چُپ ہو جاؤ تم...... کچھ نہیں جانتے...... میں خود زخمی کرتی ہوں...... غصّے میں اپنے آپ کو...... سر ٹکراتی ہوں اپنا۔ میں خود......'' ملیحہ نے سر جھٹک کر کہا۔

''معلوم ہے مجھے۔ بچپن سے جانتا ہوں آپ کو...... مگر کون کرواتا ہے یہ سب آپ سے...... یہ ماحول تو کسی دن...... سچ مچ ہی پاگل کر دے گا...... آپ کو...... میں اسی خیال سے ڈرتا ہوں...... آپ پر...... اب اور ستم نہیں ہونے دوں گا...... ہرگز...... ہرگز نہیں......''

وہ خاموش ہو گیا۔ ملیحہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ حیران حیران سی۔

پھر وہاں سے اٹھی......اور آپس میں جڑے ان دو پتھروں کے قریب کھڑی ہوگئی جو فیصل نے پچھلی دفعہ دیکھے تھے۔فیصل نے اس طرف دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ بڑے پتھر کو تراش کراس نے ایک بیٹھی ہوئی عورت کا مجسمہ بنایا تھا،جس کے نقوش ابھی واضح کرنا باقی تھے اور چھوٹے پتھر کواس نے مکمل تراش لیا تھا۔ایک چھوٹے سے بچے کا مجسمہ جو ماں کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ جہاں سے دونوں پتھر آپس میں جڑے تھے وہاں اس نے بچّے کے شانے کی گولائی سے شروع کر کے ماں کا پلّو تراش لیا تھا۔ وہ دنگ رہ گیا...... یہ شاہکار اور اتنے کم وقت میں...... کتنی محنت کی ہوگی اس نے......دن رات...... کس قدر لگن...... کتنی بے قراری...... کتنی دیوانگی...... یہ عظیم فن کارہ...... یہ عظیم ہستی......

اُس نے چونک کر سر اُٹھایا۔ملیحہ بہت دیر سے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

''کیوں ناراض ہوئے تھے......وہ آپ سے......''فیصل نے پوچھا۔

''جانے کیا ہو جاتا ہے ان کو...... سمجھتے ہیں...... وقت ضایع ہوتا ہے۔ میں وقت ضایع نہیں کرتی...... آج صبح سے بھی میں نے......رو دھو کر بعد میں......اس کی انگلیاں carve کی ہیں......''اس نے بچّے کے مجسّمے پر ہاتھ رکھ دیا۔

زینہ طے کر کے وہ اوپر آ گئے۔ کشادہ سی غلام گردش سے گزرتے ہوئے فیصل ٹھٹک کر رُک گیا۔

''ذرا رُکیے......''اُس نے آگے چلتی ہوئی ملیحہ کو پکارا۔

''کیوں......'' وہ رُک گئی۔

''اِدھر آیئے نا......''اُس نے دیوار کے قریب ایزل پر رکھے بڑے سے قد آدم آئینے کی طرف اشارہ کیا۔ملیحہ آہستہ آہستہ چلتی آئینے تک آ گئی۔

''بڑی......لگتی ہیں آپ......مجھ سے کیا؟......کہیں سے بھی......؟''

وہ ملیحہ کے قریب آ کر اپنے ساتھ اس کے عکس کو دیکھ کر بولا۔

''پاگل......ہو تم......'' اس نے ہار کر کہا۔

برآمدے میں غفور نے ناشتہ چن رکھا تھا......انھیں آتا دیکھ کر مسکراتا ہوا تیز تیز چل کر باورچی خانے تک آیا اور چولہے پر چائے کا پانی چڑھا دیا۔

اُس دن فیصل کافی دیر ملیحہ کے وہاں رہا۔ دوپہر تک۔ اُس نے ملیحہ سے بہت باتیں کی۔ پہلی دفعہ ملیحہ نے کسی سے اتنی باتیں کی تھیں۔ پہلی دفعہ کسی نے اس کی باتیں سنی تھیں......پہلی بار اس شام اس کا دل ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا......اور پہلی بار اسے فیصل کی قربت میں ایک عجیب تجربہ ہوا تھا کہ اسے اپنا آپ دفعتاً مضبوط محسوس ہونے لگا تھا۔ اس سے قبل اپنی بات کہتے ہوئے اس کا اعتماد تھرّانے لگتا تھا۔ آج ایسا نہیں ہوا تھا......آج اس نے خود میں وہی اعتماد پایا تھا جو کوئی فن پارہ تراشتے ہوئے اس کے اندر طغیانی پر آئے سمندر کی طرح موجزن ہوتا تھا۔ جس کی سمت کا تعین صرف وہ خود کر سکتی تھی......صرف اور صرف اس کا اپنا وجود۔ آج ایک اور وسیلے سے وہ اپنے کھوئے ہوئے اعتماد سے دوبارہ متعارف ہوئی تھی جو شادی کے فوراً بعد اس سے لحظہ بہ لحظہ چھنتا چلا گیا تھا۔ لٹتا چلا گیا تھا......جب جب ملیحہ نے اُسے بحال کرنے کی سعی کی، کسی نے اُس پر شب خوں مار دیا تھا۔

فیصل اس کی ہر بات کو غور سے سنتا رہا تھا۔ اُس نے براہ راست اُس سے کوئی سوال نہ کیا تھا۔ وہ خود ہی اُسے اپنی باتیں سنا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے۔ مخروطی لانبی فن کار انگلیوں سے کانٹے میں ناشتے کے ننھے ننھے ٹکڑے پرو کر دہانے

تک لے جاتے ہوئے۔ کہنے لگتی تو چلتا ہوا چمچ پیالی میں ٹھہر جاتا۔نوالا کلّے میں لیے نگلنا بھول جاتی......دیوار......یا ستون پر یا ستون اور زینے سے ہوتی ہوئی ہری گھاس پر......یا گھاس پر سے تنکے تلاش کرتی کسی چڑیا پر، اُس کی نگاہیں اٹک کر رہ جاتیں......اور وہ کوئی دُکھ، کوئی غم، کوئی بہت پہلے گزرا حادثہ، ایسے بیان کرتی کہ اندازہ ہو جاتا، یہ درد کتنا تازہ ہے اُس کے اندر......فیصل دیکھتا رہ جاتا۔اس حساس دل پر......ان کمزور نسوانی شانوں پر......اس ننھی سی جانِ ناتواں پر کتنے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔رنج والم کے......وہ سوچتا رہتا۔

''گھر میں......ہوتے ہیں تو میں سٹوڈیو کی طرف جاتی بھی نہیں......کوشش میں لگتی رہتی ہوں کہ......سب کچھ ٹھیک سے ہوتا رہے......کوئی تکلیف نہ ہو انہیں۔اور کبھی بھی کوئی تکلیف ہوئی نہیں انھیں......پھر بھی......جانے کیوں......''

کبھی بات کرتے کرتے وہ خاموش ہو جاتی۔

''جانتے ہو......یہ دو مجسمے......نہیں مجسمہ......ماں اور بچے کا یہ مجسمہ......جانے کب سے بنانا چاہتی تھی میں۔مگر یہ بات میں جانتی ہی نہیں تھی......''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔آویزے لہرانے لگے۔سنہری جلد والے نازک سے کانوں میں کالے کرتے سے میچ کرتے ہوئے سیاہ موتی کی ایک ایک چھوٹی سی لڑی والے آویزے۔شاید کل پہنے ہوں اُس نے......کہ الجھے سے بال......مانڈ کھو چکا ململ کا کرتا دیکھ کر فیصل کو یہی اندازہ ہوا۔رات بھر کام کیا ہوگا اُس نے۔پھول سے ہاتھوں سے پتھر توڑے ہوں گے۔

''آدھا مجسمہ تراشنے کے بعد......یہ بات محسوس کی تھی......میں نے......کہ میں برسوں سے اس کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی......اپنا وقت دے کر بنایا ہے اسے......کسی کو Disturb نہیں کیا......AC کا شور تھا اُن کے کمرے میں......تہہ خانے میں سے آواز وہاں پہنچتی ہی نہیں......پھر بھی......ناراض ہو گئے۔ان کی باتوں کی ضرب سے میں ریزہ

ریزہ ہو جاتی ہوں۔''

اس کے چہرے پر گہری اداسی چھا گئی۔ کئی منٹ خاموشی چھائی رہی۔ پنکھا بے آواز گھومتا رہا۔ مالی، اشوک کے درخت کے سائے میں لمبے سے چمن میں لگے گیندے کی زرد مرجھائی اداس سی کیاریوں کی جگہ سوسن کے آسمانی رنگ کے پھولوں والے پودے لگا رہا تھا۔ خاموش دوپہر قیلولہ کر رہی تھی۔ کل کی بارش نے آج کا موسم کچھ اچھا سا کر دیا تھا۔

''مگر اس مجسمے کو دیکھ کر...... اچھا لگتا ہے...... بہت اچھا لگتا ہے مجھے......'' ملیحہ کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم تھک گئے ہونا...... میری باتیں سن سن کر......'' اس نے فیصل کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... آپ بتایئے اپنی ساری باتیں...... مجھے...... میں سارے مسئلے حل کر دوں گا آپ کے۔''

''آپ بس دیکھ لیجئے گا......'' وہ خود اعتمادی سے مسکرا دیتا تو ملیحہ کو اُس کی باتوں کا یقین آنے لگتا۔

وہ چلا گیا تو وہ گھنٹوں حیرت زدہ سی سوچتی رہی کہ کوئی کسی دوسرے میں اتنی زیادہ دلچسپی کیسے لے سکتا ہے...... اتنا زیادہ...... کیسے...... یہ سب کیوں...... میری فکر کوئی کیونکر...... کیوں کر سکتا ہے...... مجھ میں ایسی کوئی بات ہے نہیں۔ فن شناسوں کی ملکیت کیسے ہو سکتی ہوں میں۔ میں کوئی ایسی بڑی فنکارہ تو ہوں ہی نہیں کہیں سے...... کچھ بھی تو Achieve نہیں کیا میں نے...... پھر...... یہ فیصل...... کیا کہتا ہے۔ کیوں کہتا ہے...... کہیں...... کہیں اس کا کوئی Blackmailing کا ارادہ...... تو نہیں...... کہیں...... ایسا ہی تو نہیں...... یا...... شاید Emotional Blackmail۔

فیصل ان دنوں اکثر اُس کے یہاں دو تین گھنٹے گزارتا۔ تقریباً ہر شام...... کبھی اکبر علی کی موجودگی میں...... کبھی اس کی غیر حاضری میں...... اور ملیحہ سوچوں میں کھو جاتی۔

یہ مجھے کسی مصیبت میں تو نہیں ڈالنے جا رہا...... آخر اسے...... چاہئے کیا مجھ سے...... میرا اس کا جوڑ کیا ہے...... ڈھلتی شام میں...... یہ روشن دن بھلا...... کیا تلاش کرتا ہے...... یہ سب دھوکا ہے...... جانے کیا ارادے ہیں اس کے...... عافیہ سے دور ہے یہ...... یہاں اکیلا...... کیا سوچ رکھا ہوگا اس نے۔ کوئی بہروپیا...... ہوگا...... کوئی...... ہاں یقیناً......

ملیحہ کا مدتوں سے فریب کھاتا آ رہا دل اس خیال پر آ کر ٹھہر گیا۔ اگلے دن فیصل کا فون آیا تو اس نے کہلوا دیا کہ گھر میں نہیں ہے۔

پھر...... کہ سو رہی ہے۔

پھر...... کہ صاحب کے ساتھ باہر گئی ہے۔

پھر...... گھر میں مہمان آئے ہیں۔

ایسے ایسے بہانے دن میں درجن بھر بار بننے لگے...... کہ وہ کئی بار فون کرتا...... وہ کئی بار منع کروا دیتی۔

''اُف...... شکر ہے...... آواز تو سنائی دی......'' ایک دن بہت صبح فیصل نے فون کیا تو ملیحہ نے ہی اٹھایا تھا۔

''ہاں...... کیسے ہو...... میں ذرا مصروف رہی......'' وہ مضبوطی سے بولی۔

''ایسی بھی مصروفیت...... ہماری یاد بھی نہ آئی...... آپ کو......'' اس کی آواز میں شکوہ تھا۔

''واقعی نہیں آئی...... کچھ مہمان...... کچھ باہر......'' وہ کچھ اونچی آواز میں ہنسی۔

''دھوکا دے رہی ہیں نا...... خود کو...... یہ کھوکھلی ہنسی......'' وہ دفعتاً اداسی سے بولا۔

''دھوکا تم دے رہے ہو خود کو......'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''کیا...... کیا آپ نے...... واقعی مجھے یاد نہیں کیا۔ کیا آپ واقعی بہت خوش ہیں میرے وہاں آئے بنا...... کیا......''

''ہاں...... ہاں...... ہاں...... سمجھے......؟'' اُس نے چیخ کر کہا اور فون بند کر دیا۔ اکبر علی سو رہے تھے۔ ملیحہ باغیچے میں ننگے پاؤں ٹہل کر رویا کی۔ اس کے بعد پورا دِن فیصل کا فون نہیں آیا...... دوسرے دن بھی نہیں اور تیسرے دِن بھی نہیں...... چوتھے دِن ملیحہ کو اچانک تشویش ہونے لگی...... اس نے صبح فون کیا...... کسی نے اٹھایا نہیں...... شام کو بھی نہیں...... رات دیر سے کیا، جب بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

تین دن ملیحہ کے فون کے انتظار میں...... فیصل رویا تھا جبکہ وہ پہلے اپنی یادداشت میں کبھی نہیں رویا تھا۔ جب بھی اس کا دل بھر آیا وجہ ملیحہ ہی رہی۔

تیسرے دن تک جب ملیحہ کا فون نہیں آیا تو برداشت کی ختم ہوتی ہوئی سکت کو فیصل نے نیند کی گولیاں کھا کر بہلانا چاہا کہ سو جائے گا تو شاید آرام ملنے کے بعد برداشت کا مادّہ کچھ بڑھ جائے۔

جبھی عجیب سے خوف کے زیرِ اثر ملیحہ کھنچی سے اس کے یہاں پہنچی۔ دہلیز کے باہر دو دن کے اخبار رکھے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازے سے ملحقہ کھڑکی کی جالی کو کسی طرح تھوڑا سا توڑ کر ملیحہ کے ڈرائیور نے اندر کی چٹخنی ہاتھ ڈال کر کھول لی کہ مسلسل بجتی ہوئی دروازے کی گھنٹی کا کوئی جواب نہ آ رہا تھا۔

فیصل پوری طرح بے ہوش تھا۔ ملیحہ نے ڈاکٹر بلوا لیا اور آدھے دن کی مسلسل کوشش

کے بعد وہ ہوش میں آیا۔

''میں نے...... دعا مانگی تھی...... کہ میری زندگی آپ کو مل جائے۔''

اُس نے ملیحہ کے ہاتھ سے بازار سے منگوایا ہوا جوس لیتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ پاگل ہی رہو گے...... مجھے تو مرنا ہی ہے تم سے پہلے...... بہت پہلے......'' اُس کی آواز میں الجھن سی تھی۔

''پہلے میں نے مانگا تھا کہ...... مجھے موت آ جائے...... پھر میں نے سوچا کہ...... آپ میرے بنا...... کیسے جئیں گی......''

کتنے اعتماد سے کہہ رہا تھا وہ...... ملیحہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

''تم تو...... سچ مچ ہی پاگل ہو......''

''کہہ لیجئے۔ ثابت کردوں گا ایک دن...... یہ سب باتیں...... پھر میں نے کہا کہ...... ایک ساتھ اٹھالے ہم دونوں کو...... تو ہم میں سے کوئی تڑپے گا نہیں...... آپ...... یہ کہنا چاہتی ہیں نا کہ آپ کو مجھ سے کوئی مطلب نہیں......؟...... سِسک سِسک کر مر جائیں گی آپ...... دم گھٹ جائے گا آپ کا...... میرے بغیر...... وہ...... مار ڈالے گا...... آپ کو وہ...... اصغر علی......'' وہ کمزور معلوم ہو رہا تھا۔

''کون......؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''وہی جسے لوگ اکبر علی کے نام سے جانتے ہیں...... میں جانتا ہوں کہ...... کہ اپنے قد و قامت کی طرح...... وہ اندر سے اور بھی زیادہ چھوٹا ہے...... اصغر علی ہونا چاہئے تھا۔ اُس کا نام۔ اکبر علی کی بجائے......''

ملیحہ بے ساختہ مسکرادی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

''کبھی فون پٹخ کر......'' وہ شکوہ بھری نحیف آواز میں بولا......

موت آ جائے گی مجھے...... پھر...... پھر...... ایسا نہ کیجئے گا......''

''نہیں...... کروں گی......'' وہ سر جھکائے شرمندہ سی آواز میں بولی۔

اُس کے بعد ملیحہ نے واقعی اس سے کوئی بے رخی نہیں برتی......فون کرتا تو خوشدلی سے بات کرتی......گھر آتا تو بھی۔

اس دوران ملیحہ نے ماں اور بچّے کا مجسمہ بالکل مکمل کرلیا تھا۔اس دن وہ بہت خوش معلوم ہورہی تھی۔

''آج میرا کام پورا ہوگیا فیصل......''اس نے فیصل کو فون کر کے چھلکتی ہوئی خوشی سے بھری آواز میں کہا۔

''کون سا...... بچّے والا نا؟''

''ارے مبارک ہو......اسے تو Celebrate کرنا چاہئے...... ہے نا......؟'' وہ سن کر بہت خوش ہوا۔

''ہاں......کرنا تو چاہئے۔''

''مگر میں پارٹی دوں گا......کہاں، یہ آپ بتائیں......شیرٹین......تاج......میریڈین ......یا......'' وہ گرم جوشی سے بولا۔

''جی نہیں......گھر پر......میرے گھر کے برآمدے میں......تم اور میں بیٹھ کر چائے نوش کریں گے......اور مجسّمے کی تعریف کریں گے......'' وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''وہ تو ہم روز کرتے ہیں وہاں......مگر......آئیڈیا برا نہیں ہے۔'' وہ بھی ہنسا۔

''میں سوچ رہا تھا......ایک Exhibition ہوجائے آپ کے مجسموں کی......'' اُس شام برآمدے میں چائے پیتے ہوئے فیصل نے ملیحہ سے کہا۔

''کیا......ایسا ہوسکتا ہے......'' وہ مسرت بھری بے اعتباری سے بولی۔

''Of Course ہوسکتا ہے۔میں کسی Photo Journalist سے تصویریں

اتروا ہیں گا سب کی...... آپ تہہ خانے میں انھیں ذرا ترتیب سے لگوا لیجئے گا ایک طرف......بس......ذرا دور دور۔''

''نہیں...... برا لگے گا انھیں......''اس کی نظروں کی چمک یکا یک غائب ہوگئی۔

''کس کو...... او...... اصغر علی صاحب کو...... نہیں لگے گا۔'' وہ مسکرایا۔

''ان کی اجازت سے ہی ہوگا......''

''وہ کبھی اجازت نہیں دیں گے...... اور ویسے بھی انھیں تہہ خانے کا Renovation کرانا ہے...... کہتے ہیں خوامخواہ جگہ گھیر رکھی ہے...... اس لیے میں نے ان سب مجسموں کو ایک جگہ کر دیا ہے کونے میں......''

''ہم کوشش تو کر سکتے ہیں...... ہے نا......'' وہ نرمی سے سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''پھر...... ورنہ...... کوئی اور انتظام کرلیں گے...... اور تروینی کلا سنگم میں نمائش......''

''یہ تو خوابوں کی باتیں ہیں فیصل...... میرے نصیب میں کہاں اتنی بڑی خوشی۔''

''کیوں نہیں ہو سکتی...... ہوگی اور ضرور ہوگی۔ میں بات کروں گا نا۔ انکار نہیں کریں گے۔ اتنے بھی برے نہیں ہیں بھائی وہ......''

''جو شخص سرے سے ہی اس کے خلاف ہو...... وہ نمائش کی اجازت کیسے دے دے گا...... اور تمہارے کہنے سے کہیں...... کہیں...... کچھ زیادہ ہی برا نہ مان جائیں...... پھر...... رہا سہا سکون بھی...... نہیں فیصل...... جانتے ہو۔ ماں اور بچے کے اس مجسمے کے بعد...... میں خود اپنے آپ کو اتنا مکمل سمجھ رہی ہوں...... کہ جیسے...... جیسے اب مجھے اور کچھ تخلیق ہی نہیں کرنا...... جیسے میں نے سب سے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہو...... جیسے...... جیسے......''

وہ ہنس کر خاموش ہوگئی۔

بہت پہلے ایک دفعہ پھاٹک کے ستون بنانے کے لیے لائے گئے ایک پتھر کو ملیحہ نے ملازم سے اٹھوا کر تہہ خانے میں رکھوایا تھا کہ گرنے سے پتھر کا بڑا سا حصہ ٹوٹ گیا تھا اور دوسرا کوئی پتھر اس جسامت کا نہ تھا کہ دونوں کو دو ستونوں میں استعمال کرلیا جاتا۔ ملیحہ کو اس میں ایک خوبصورت مجسمہ نظر آ گیا تھا جو بعد میں چھاتی تک تراشتے ہوئے وجیہہ شانوں والے مرد کے مجسّمے کی صورت میں سامنے آیا...... مگر اکبر علی پتھر تہہ خانے لے جانے سے چراغ پا ہوگئے تھے...... سب مزدوروں کے سامنے ناراضگی کا اظہار کیا تھا...... جانتیں نہیں...... کتنا مہنگا ہے آج پتھر...... ضایع کرنے کے لیے نہیں منگوائی جاتیں...... یہ چیزیں...... حقارت سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تھا اور منہ پھیر لیا تھا۔

ملیحہ کو سارا واقعہ من وعن یاد تھا...... درد اُس کے چہرے پر ظاہر ہو گیا۔

''یا یوں بھی...... ہوسکتا ہے کہ......'' فیصل نے اسے اداس ہوتے دیکھ کر کہا۔

''کہ تہہ خانہ جب...... خالی ہوگا تو انھیں کام کروانے میں آسانی ہوگی...... پھر تو وہ خوشی سے تیار ہو جائیں گے...... ہے نا؟''

''ہوسکتا ہے...... شاید......'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''پہلے...... گیلری بک کروانا ہوگی...... تاریخ ملتے ہی ان سے بات۔''

''ہاں...... شاید...... یہ ٹھیک رہے گا......''

جس دن ملیحہ اور فیصل ہال بک کرنے کے لیے پیشگی رقم دینے آرٹ گیلری گئے تھے اسی دن مزدور آ گئے تھے۔ سارے کام اکبر علی خود کرواتے تھے، کسی کی اطلاع اور مشورے کے بغیر۔ لہٰذا اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ تہہ خانے کا سارا کوڑ کباڑ، اینٹ پتھر وغیرہ نکال دیا گیا تھا اور دونوں دالانوں کی درمیانی دیوار توڑ کر اسے وسیع ہال بنانے کے لیے کام شروع ہو چکا تھا۔ مجسّمے باغیچے میں باورچی خانے والی دیوار کے ساتھ رکھوائے جا چکے تھے۔ اکبر علی

کے دفتر کے منیجر کی نگرانی میں یہ کام ہو رہا تھا۔ مجسموں کے تحفظ کی صاحب کی طرف سے کوئی ہدایت نہ تھی اور بیگم صاحبہ گھر پر موجود نہ تھیں۔

لوٹتے وقت ملیحہ کو گھر چھوڑ کر فیصل باہر ہی سے چلا گیا تھا۔ ایک فوٹو جرنلسٹ سے اس کی ملاقات کا وقت طے تھا۔

اُس شام جب فیصل فوٹو جرنلسٹ کو لے کر ملیحہ کے یہاں پہنچا۔ تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ ملیحہ اپنے تازہ ترین شاہکار کے قریب بیٹھی تھی...... بچّے کا مجسمہ جو ماں کے پہلو سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا۔ وہ اسے ماں کے مجسمے کے ساتھ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پتھروں کی طرح زمین پر پھینکے جانے سے کئی مجسمے کہیں کہیں سے ٹوٹ گئے تھے۔ بچّے کا مڑا ہوا گھٹنا بھی، جس کے سہارے مجسمے کا توازن برقرار رہتا تھا، ٹوٹ گیا تھا۔ ملیحہ کبھی گھٹنے کا اور کبھی باقی کا حصّہ ساتھ ساتھ رکھتی مگر کوئی کسی طرح ٹھیک نہ بیٹھ پاتا۔

فیصل فوٹوگرافر کو لے کر کب آیا ملیحہ کو خبر ہی نہ ہوئی اس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ وہ کچھ لمحے فوٹوگرافر کے ساتھ کھڑا چپ چاپ یہ منظر دیکھتا رہا۔ اُس نے جب ملیحہ کے جسم کو وقفے وقفے سے ہلکے ہلکے لرزتے دیکھا تو وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ملیحہ اُس کی طرف پلٹی۔

ملیحہ کی وحشت زدہ سی آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ اُس نے دونوں رخسار ناخنوں سے نوچ ڈالے تھے۔ لکیروں پر خون جم چکا تھا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب چل رہی تھیں۔

''یہ...... یہ...... یہ دیکھو...... فیصل...... فیصل۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

''سب...... مر گئے......''

اس نے ہاتھ سے ماں اور بچّے کے مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دیکھو...... یہ...... یہ ماں کے پاس بیٹھتا ہی نہیں......'' اُس نے بچّے کے سر پر دنوں ہاتھ رکھ دیے۔

''اس کا گھٹنا...... ٹوٹ...... گیا۔'' اُس نے فیصل کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں جانے کب کے ٹھہرے ہوئے آنسو اُمڈ آئے۔

''اب...... کیا...... کیا...... ہوگا......'' اُس نے دونوں ہاتھ فیصل کے شانوں پر رکھ دیئے اور بلک بلک کر رو پڑی۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا...... فیصل...... سب مر چکے......'' اُس نے ہچکیاں لے کر کہا اور بے ہوش ہوگئی۔ اس کے گھاس پر لڑھکنے سے پہلے فیصل نے اسے شانوں سے تھام لیا تھا۔

فوٹو گرافر نے فن کے ایسے نادر نمونے پہلے کبھی دیکھے تھے نہ ایسی فنکارہ۔ وہ ایک لمحہ ضائع کے بغیر تصویریں کھینچنے لگا۔

جب ملیحہ کو ہوش میں لایا گیا تو وہ بالکل پرسکون تھی۔

اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی...... سب کو باری باری دیکھا۔ ڈاکٹر کو...... فیصل کو...... اکبر علی کو......

اس کی نظریں اکبر علی پر ٹھہر گئیں۔

''سب...... مر گئے......'' اس نے نہایت معصومیت سے اطلاع دی۔ ''کوئی نہیں بچا...... سب...... مر گئے...... سب مر گئے۔'' وہ رُک رُک کر بولی۔ ''سب مر گئے۔ سب مر گئے سب!'' اُس نے جلدی جلدی کہا۔ پھر چُپ ہوگئی۔ اور پلنگ سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی، اور چیخ چیخ کر یہی جملہ دہرانے لگی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دہراتی رہی۔

''اوہ...... یہ تو سچ مچ ہی......'' اکبر علی حسبِ معمول بے تاثر چہرہ لیے پُرسکون لہجے میں بولے۔

''نہیں...... سچ مچ...... یعنی کہ......'' فیصل نے تشویش ناک لہجے میں جلدی سے کہا۔

''ہاں...... سچ مچ پاگل ہوگئی ہے...... میں کہتا تھا نا کہ یہ......'' اکبر علی بولا۔

''نہیں...... یہ وقتی طور پر صدمے کا اثر ہے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں...... ٹھیک ہو جائیں گی...... میں کچھ دوائیں لکھے دیتا ہوں......''

ڈاکٹر نے دواؤں کی لمبی سے فہرست میں زیادہ تر نیند کی گولیاں ہی لکھی تھیں۔

مگر گزرتے وقت نے ثابت کر دیا کہ ملیحہ کی یہ حالت وقتی نہ تھی۔ وہ اپنے وجود سے بالکل بے خبر ہو چکی تھی۔ ایک جگہ بیٹھتی تو بیٹھی رہ جاتی۔ کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ پہننے اوڑھنے کا احساس۔ پتھر کی مورت سی کسی شے کو گھورتی رہ جاتی۔ کوئی بات کرتا تو جواب نہ دیتی۔ بار بار پوچھتا تو جھنجھلا کر رونا شروع کر دیتی۔ بالکل بچوں کی طرح۔

اکبر علی نے اس کے لیے علیحدہ کمرے کا انتظام کروا دیا تھا اور اسے ایک نرس کے سپرد کر دیا تھا۔

فیصل کئی ڈاکٹروں سے اس کا معائنہ کروا چکا۔ مگر کوئی علاج کارگر ہوتا نظر نہ آ رہا تھا۔ فیصل اسے ہر شام دیکھنے آ جاتا اور دیر تک وہیں رکتا، جب تک وہ سو نہ جائے۔ کبھی کبھی اکبر علی سے ملاقات ہو جاتی اگر وہ جلد آ جاتے۔ اب وہ کچھ زیادہ دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ اُن کا کام شاید بڑھ گیا تھا۔ مزاج اور معمول میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ بلکہ پہلے کے مقابلے کچھ کم بولنے لگے تھے۔ اور تہہ خانے کا اپنی نگرانی میں مزید تزئین کروا رہے تھے۔ وہاں اُن کا ایک پرائیوٹ آفس کھولنے کا ارادہ تھا۔

فیصل کی صحت کچھ گر گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار صاف عیاں رہا کرتے تھے۔ وہ ملیحہ کو بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کرتا۔ مسکراتا اور ہنستا بھی...... مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہ ہوتا۔ وہ بس اُسے دیکھتی رہتی ٹکر ٹکر۔ کسی طرح کمرے سے باہر آنے پر بھی راضی نہ ہوتی۔ تازہ ہوا کے لیے نرس اگر نیم غنودگی کے عالم میں اسے فیصل کے سہارے باہر لے بھی آتی تو، ہاں بھی وہ کسی شے پر ٹکٹکی باندھے رہ جاتی۔

اگر مجسّموں کی ۔ ان ٹوٹے ہوئے مجسّموں کی نمائش کردی جائے تو شاید...... شاید ملیحہ ہوش میں آجائے...... کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔

فیصل نے کئی بار سوچا تھا۔ اور ایک دن مجسمے اٹھوالایا تھا۔ اکبر علی نے کبھی پوچھا تک نہ تھا کہ مجسّمے کیا ہوئے ۔

تہہ خانے میں ردّ و بدل زوروں پر تھا۔ اُدھر جانے والے زینے کی شکل بالکل بدل گئی تھی ۔ اب وہاں گہرے سبز سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر اخروٹ کی منقش لکڑی کے فریم والا ہلکے ہرے رنگ کا نقشیں کانچ لگا دروازہ لگ گیا تھا ۔

ادھر کئی دنوں سے ملیحہ میں ایک تبدیلی یہ آئی تھی کہ وہ اب کمرے سے نکل کر اس کانچ کے دروازے تک چلی جاتی ۔ اور اس کے آس پاس دیکھ کر پلٹ آتی ۔ چپ چاپ ۔ پریشان سے چہرے پر پھٹی پھٹی آنکھیں لیے ۔

کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور پھر ایک شام ملیحہ نے دروازے کو اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا۔ اگر نرس آواز سن کر بروقت بھاگی نہ آتی تو ملیحہ ٹوٹے کانچ کے درمیان سے اندر گھسنے کی کوشش میں خود کو بری طرح زخمی کر سکتی تھی ۔ اکبر علی جب آئے تو انھوں نے لمبی لمبی بیلوں اور بڑے بڑے پھولوں والے ہلکے ہرے رنگ کے کانچ کی بے شمار کرچیں غلام گردش میں نسب پیلی روشنی والی بتیوں کے عکس سے جھل مل جھل مل کرتی دیکھی تھیں ۔

اگلا دن نمائش کا آخری دن تھا۔

اسے ایک بار ملیحہ کو کلا سنگم لے جانا ہی ہوگا...... کسی بھی طرح۔ اُس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کل وہ اور صبح جائے گا ملیحہ کے وہاں ۔

گھر پہنچ کر اُس نے اپنے آپ کو صوفے پر گرا دیا۔ کچھ لمحوں بعد ہی غفور نے فون کر کے بتایا کہ صاحب بیگم صاحبہ کو پاگل خانے چھوڑ آئے ہیں ۔ وہ الٹے پاؤں گھر سے باہر

نکلا اور پاگل خانے پہنچ کر ہی دم لیا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی روح کانپ گئی، ملیحہ کے لمبے بال دھول میں اٹے بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی چہرے پر بے شمار خراشیں تھیں۔ اور وہ فرش پر بیٹھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ سلاخوں سے بنی Grill کے اس طرف موٹی توند والا چوکیدار اور اس کے دو ہم شکل اتنی زور زور سے ہنس رہے تھے کہ ان کا بدن قہقہوں کے ساتھ ہچکولے کھا رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے دوسری جانب دیکھا۔ اکبر علی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ فیصل کا خون کھول اُٹھا۔

''اصغر علی......''

وہ پوری طاقت سے چیخا...... اور...... آنکھیں کھول دیں۔ صوفے پر آڑھا لیٹا وہ پسینے میں نہا گیا تھا۔ کونے میں رکھی تو سیہ میز پر ریڈیم لگی سوئیوں والی گھڑی اندھیرے میں اکیس بجا رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھتا ہوا وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

اُسے کل ملیحہ کو اپنے ساتھ آرٹ گیلری لے جانا ہے...... یہ بے حد ضروری ہے...... اس نے اطمینان سے سوچا اور نہانے چلا گیا۔

نہا کر وہ خود کو کچھ تازہ دم محسوس کرنے لگا مگر ذہنی طور پر مسلسل سوچوں میں گم رہا......

سونے کی کوشش میں جب وہ گھنٹوں کروٹیں بدل چکا تو آخر کار اس نے سرہانے کے قریب مسہری میں لگی دراز میں سے نیند کی گولیوں کا پتہ نکالا اور دو گولیاں کھا کر سکون سے سو گیا......

اگلی صبح وہ غفور کے فون سے بیدار ہوا تھا۔

''صاحب بیگم صاحبہ کو دماغی ہسپتال لے جا رہے ہیں...... سسٹر سے کہہ رہے تھے کہ برقی جھٹکوں سے وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔''

یہ خواب نہیں تھا۔

جانے ملازم نے اور کیا کیا کہا تھا۔

فیصل جب عجلت سے تیار ہو کر نکلا تو دہلیز کے قریب پڑے اتوار کی صبح کے روزانہ سے کئی گنا بھاری گول گول لپیٹے گئے اخبار کا ریز اُس کے پاؤں کی ٹھوکر سے ٹوٹ گیا تھا اور فنون لطیفہ سے متعلق صفحات پر عظیم فن کارہ ملیحہ اکبر علی پر لکھا گیا تفصیلی مضمون چھپا تھا۔ اور ساتھ میں ٹوٹی ہوئی مورتیوں کے سامنے گھاس پر بیٹھی ملیحہ اکبر علی کی مختلف زاویوں سے لی گئی تصویریں بھی۔

اپنے ہی ناخنوں سے کھرچے گئے رخساروں پر پھٹی پھٹی آنکھوں میں لبالب بھر آئے آنسوؤں بھری تصویریں۔

مجسّموں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے بے ہوش ہو کر گرتی ہوئی تصویریں۔

فیصل جب ملیحہ کے وہاں پہنچا تو وہ سو رہی تھی۔ اکبر علی باہر جانے کے لیے ڈرائنگ روم میں تیار بیٹھے تھے۔ عمدہ آفٹر شیو کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ نیا ڈاکٹر آنے والا تھا۔

فیصل بغیر اکبر علی سے ملے سیدھا ملیحہ کے کمرے میں چلا گیا۔ کانچ توڑ کر ہاتھوں کو زخمی کر دینے کے بعد سے اسے کل شام ہی سلا دیا گیا تھا۔ آتی ہوئی سردیوں کی خوشگوار دھوپ اس کے بازو پر پڑ رہی تھی جس کے پٹّی بندھے ہاتھ کی ساری انگلیاں سوجی ہوئی تھیں۔ دوسرا ہاتھ اس نے سر کے نیچے رکھا تھا۔ جس کی زخمی ہتھیلی سر کے بوجھ سے دوبارہ خون آلود ہو گئی تھی...... اور سفید پٹّی لگی انگلیوں کے پوروں پر تازہ سرخی نظر آ رہی تھی...... فیصل نے اس کا ہاتھ سر کے نیچے سے نکال کر سیدھا کیا...... وہ بے خبر سوئی رہی۔ نرس نے اُس کے دو چوٹیاں گوندھی تھیں جو ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی چلی گئی تھیں۔ ناک کی لونگ شاید کہیں گر گئی تھی۔ چہرہ دبلا ہو گیا تھا۔ فیصل اس کو کئی پل دیکھتا رہا...... نرس اس کے

ہاتھ کی پٹی بدل کر چلی گئی۔

فیصل نے ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔

''آپ...... آپ......'' وہ اس کے کان کے پاس سر جھکا کر اداسی سے بولا۔

''مت کیجئے اس طرح......''

اُس کی آواز بھرّا گئی۔

وہ اس کا سر سہلانے لگا۔

''میں بہت بڑا...... Studio بنواؤں گا...... ہر قسم کا پتھر...... دنیا کے ہر کونے سے......'' فیصل نے ماتھا اس کی مسہری کے کنارے ٹکا دیا۔

''......آپ اچھی ہو جائیں......''

وہ سوتی رہی...... وہ آنکھیں بند کیے روتا رہا......

اُس نے سر اُٹھا کر ہاتھ کی الٹی طرف سے اپنی آنکھیں پونچھیں تو اس کی نظر دروازے کی طرف اُٹھ گئی جہاں اکبر علی، نرس اور دماغی ہسپتال کا باوردی ڈاکٹر کھڑے تھے۔ وہ انھیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اکبر علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''انھیں...... مت لے جایئے۔ پاگل خانے......'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''انھیں...... میں اپنے گھر لے جاؤں گا...... وہیں علاج کرواؤں گا۔''

اُس نے ٹھہر ٹھہر کر مضبوطی سے کہا۔

''انھیں...... مجھے دے دیجیے......'' وہ اکبر علی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جس پر قطعی کسی تاثر کی جھلک نہیں تھی اور وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

مرارختِ سفرآنسو

(ایک سچے واقعے پر مبنی)

شجر کو دیتی ہوں پانی، وہ آگ اگلتا ہے
میں فصل خار کی چننے کو پھول بوتی ہوں

''ذرا اُدھر دیکھونا ۔۔۔نئے زمانے کی طرف۔''
مسز ملہوترا نے سبزی سے بھری ہاتھ گاڑی سے سبزیاں چن کر ترازو میں رکھ رہی کسم کو کہنی سے ٹھوکا دیااور دوبارہ مشرق کی جانب کھڑی لمبی سی چمکیلی نیلی گاڑی کی طرف دیکھا جہاں ڈرائیور نے کار کا دروازہ تھام رکھا تھا اور منی اس میں بیٹھنے والی تھی۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے انگلیوں سے اپنے نہایت ہلکے رنگے بھورے بال ماتھے سے سر کی طرف سنوارے اور ایک قدم گاڑی میں رکھا مگر فوراً ہی پاؤں واپس نکال کر گھر کے پھاٹک کی جانب نظر ڈالی۔ پھر چار، چھ قدم چل کر پھاٹک کے قریب گئی اور اس کے ستون میں لگے ڈور فون پر نفاست سے ترشے زرا زرا سے بڑھائے گئے ناخنوں والی سبک سی انگلی رکھ کر ہٹا دی تو لال بتی والے چھوٹے سے سپیکر سے آواز گونجی،

''آئی بیٹا۔۔بس ایک سیکنڈ۔۔تم بیٹھو گاڑی میں۔''

''quick mama...'' منی نے دھیرے سے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھی۔
پھاٹک کے باہر کچھ دور تک گہرے سبز سنگِ مرمر کی ٹائلیں نصب تھیں اور پھر گلی نما سڑک پر

کنکریٹ بچھا تھا جس پر اس کی اونچی ایڑھی والے نازک سے جوتوں کی کھٹ کھٹ بڑی با اعتماد آواز بن کر ابھری تو کسم نے جڑاؤ کنگنوں اور ہیرے جڑی انگوٹھیوں میں پھنسی گوری بھری بھری انگلیوں والے ہاتھوں میں تھاما گوبھی کا پھول جلدی سے ترازو میں ڈالا اور منی کو دیکھنے لگی۔ منی کی بالشت بھر چوڑائی والی لمبی سی کمر جہاں ختم ہوتی تھی وہاں اس نے ' ڈینم ' کے چھوٹے سے ' شارٹس ' پہن رکھے تھے اور کشتی کی ساخت کے گریبان والے بغیر آستین کے '

ٹاپ ' میں سے اس کا ایک نازک سا شانہ جھانک رہا تھا۔ اس نے کلائی میں سے گجرے کی طرح پہنا ہوا پلاسٹک کے پھولوں والا ' ہیر بینڈ ' نکالا اور بال سمیٹ کر اس میں پھنسا دیے۔ بال، ' پونی ٹیل ' کی شکل میں سمٹ آنے سے گردن کی دو ایک نازک ہڈیاں ابھری نظر آ کر اسے مزید نزاکت عطا کرنے لگیں تو کسم نے ہونٹوں کو بھینچ کر سیکنڈ بھر کے لئے بائیں جانب خم دیا اور سر ہلکے سے جھٹک کر دیکھتی رہی۔ جب تک روہنی بھی گاڑی کے قریب پہنچ گئی ۔ گہرے بھورے رنگ کے ٹراؤزرس ' پر آدھی آستینون والا ہلکا بھورا ' ٹاپ ' اور کانوں میں گریبان کی ہڈیوں کو چھوتے ہوئے لمبے سیاہ آویزے اس کی سنہری مائل سفید جلد پر جاذب سا تضاد پیدا کر رہے تھے۔ ہینڈ بیگ اور سینڈلز بھی سیاہ تھے۔ گاڑی گلی سے باہر کو روانہ ہوئی۔

'' بتاؤ جرا۔۔۔ یہ ماں بیٹیاں ہیں۔۔۔۔''

مسز ملہوترا ایک دن پہلے ' مینی کیور ' کئے گئے ہاتھوں سے بے داغ آلو چن چن کر پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالنے لگیں۔

(انہوں نے اور سبزی فروش نے ابھی تک پلاسٹک کی تھیلیوں کو ' نو ' نہیں کہا تھا۔)

کسم کی سبزیاں جب تول لی جاتیں تو ان کی باری آنے والی تھی۔۔

'' اور نہیں تو کیا۔۔ کیا پریورتن آیا ہے روہنی میم ساب میں۔۔۔۔۔ بھیا۔۔ دھنیا بھی

تا جی نہیں ہوتی تمہاری۔''

کسم گاجر کی ڈھیری کی طرف متوجہ ہوئی۔

'' ارے بی بی جی روج بھر کے بوری لاتا ہوں منڈی سے۔ اسی کلونی میں کھتم ہو جاتی ہے ۔باسی کہاں ہوتی ہے جی۔۔ ''

''اچھا چل۔۔تول اب جلدی ۔''کسم نے اپنی' ٹیلکم پاؤڈر ' لگی بھاری سی گردن پر بکھرے تازہ تراشے بھیگے بال زرا سا ہاتھ میں اٹھا کر پھیلاتے ہوئے چھوڑے اور چھوٹے سے بٹوے میں سے پیسے نکال کر گننے لگی۔

'' کیا ' میٹین ' کیا ہے ۔بٹی سے تھوڑی سی ہی موٹی ہوگی۔۔۔ ہے نا کسم۔۔۔ ''

مسز ملہوترا میتھی کا ساگ گٹھی میں سے نکال کر ترازو کی طرف بڑھانے لگیں۔

'' کب سے موسم بدلا ہے اور ایک دن بھی میتھی کے پراٹھے نہیں بنے ہمارے گھر میں ۔کل میں نے ' فریزر ' میں رکھی ساری ملائی نکلوائی ۔آدھی کا گھی بنوایا، آدھی کا مکھن۔۔۔''

'' اور نہیں تو کیا۔۔کوئی کام تو ہے نہیں اپنے سوائے خود کو سنوارنے کے۔۔۔۔۔میں صبح سے ' واکنگ شوز ' ہی پہنے ہوں کسم۔۔''

مسز ملہوترا نے اپنے پیروں کی جانب نظر ڈالی۔

''اور میں بھی۔۔''

دونوں نے قہقہہ لگایا اور اپنے اپنے گھروں کی طرف لپکیں تو مسز ملہوترا نے کسم کی طرف گردن موڑی،

''میں بھی بنا رہی ہوں آلو کے۔تُو وہیں آجانا نا جب للت چلا جائے تو۔۔۔مل کر ناشتہ کریں گے۔ہری ' بنانا شیک ' بہت اچھا بناتا ہے۔۔''

'' آپ ہی آجائیے نا مسز ملہوترا ۔۔ وہ ' سیریئل ' بھی آنے والا ہے۔آج بدھ وار ہے نا۔۔اسی ٹائم۔۔تو ساتھ دیکھیں گے۔۔۔پھر کل صبح ایک چکر ' ایکسٹرا ' لگالیں گے پارک کا۔۔۔۔ پر کچھ ہونے والا نہیں ہے ہمارا۔ ہے نا؟

'' لے کیوں نہیں۔۔ پر آنا تو ہی۔۔تُو چھوٹی ہے نا۔۔''

'' چھوٹی تو آپ بھی ہیں۔۔روہنی سے۔''

'' چھوٹی صحیح۔۔ پر موٹی بھی تو ہوں ۔۔دم پھول جاتا ہے میرا۔۔تیری سیڑھیاں چڑھتے۔۔۔اور تجھ سے تو بڑی ہوں نا۔۔''

'' دم تو میرا بھی۔۔ پھولتا ہے۔۔''

دونوں مسکرادیں۔

چندر کانت ناگ پال جب بالکنی میں آیا تو ایک کوّا کونے والے مکان کی چھت پر بھر چکی ٹنکی کے اوپر والے بغیر ٹونٹی کے ٹپکتے ہوئے نل سے پانی پینے کی کوشش کر رہا تھا۔راجن نے کوّے سے نظریں ہٹا کر سامنے املتاس کے درخت کو دیکھا ۔اس کی ٹہنیوں پر جابجا لمبی ہری ڈنڈیوں کے ساتھ نہایت حسین بڑے بڑے قرمزی پھول لٹک رہے تھے ۔ اس نے پھولوں سے نظریں ہٹائیں اور آسمان کی اجانب دیکھتا ہوا پھر سامنے دیکھنے لگا۔اس کے بعد پتلون کی جیب سے موبائل فون نکال کر اس کے دو ایک بٹن دبائے اور واپس جیب میں رکھ دیا۔وہ لوہے کے جنگلے پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا اور دور کہیں دیکھنے لگا۔جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں پر لگا چشمہ صاف کر کے دوبارہ پہن لیا۔اس کے بعد کہیں اور دیکھنے لگا۔

وہ اونچے قد کا چست آدمی تھا۔اس کے چہرے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا تاہم وہ جوان سا شخص لگتا تھا۔کئی برس پیشتر وہ ایک خوبصورت بیوی اور ایک پانچ چھ سالہ بچے

کے ساتھ اس علاقے میں رہنے آیا تھا۔ اس نے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔

ملک کے بٹوارے کے بعد جب اوم پرکاش ناگپال انڈیا آیا تھا تو 'کسٹوڈئین' سے اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ مالیت کی جائداد اپنے نام کروانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُن دنوں لاہور کی جب کی بھگوان سٹریٹ انارکلی (اوراب کی بھی) میں اس کی دودھ مٹھائی کی چھوٹی سی دوکان تھی۔ اب یہاں وہ رفتہ رفتہ ایک اچھے خاصے ہوٹل کا مالک ہو گیا۔

چندرکانت ناگپال کا گھر میں بھائیوں بھابیوں کے ساتھ رہنا جب مشکل ہوتا گیا تھا تو ایک دن وہ کرائے کے گھر میں منتقل ہو گیا۔ ان دنوں اسکے نام ایک لوہے کے سامان کا کارخانہ تھا جہاں باہر سے آئے لوہے کے کباڑ کو وہ مختلف شکلوں میں ڈھلوا کر سپلائی کیا کرتا تھا۔ اسے جُوے کی لت بھی تھی۔ وہ ریس کے گھوڑوں پر پیسے لگاتا اور اکثر جیت جاتا۔
گھر میں ایک ننھی سی بیٹی کا اضافہ ہو گیا تھا۔
ایک دن اس نے وہ گھر خرید لیا جس میں وہ کرائے پر رہتا تھا۔ بعد میں ایک عمدہ گاڑی بھی۔
بچے عمدہ سکول میں پڑھ رہے تھے۔ ایک اور گاڑی بھی آ گئی۔ شیئرز خریدے گئے، کام پھیلتا گیا۔
چندرکانت کو گھر سے باہر جا کر کام کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اکثر سارا سارا دن گھر میں رہ کر ٹیلیفون سے ہدایات دیتا رہتا۔
دو گھریلو ملازمین میں ایک عورت تھی دوسرا ایک نوجوان تھا۔ دونوں ملکر گھر اور بازار کے کام سنبھالتے تھے۔ جبکہ اس کی بیوی کو کئی دفعہ خیال آتا تھا کہ چندرکانت کو کام کی نگرانی خود بھی کرنا چاہیے۔

زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی۔ مگر جانے کب کیا ہوا کہ ریس میں پیسے لگانے کے لئے چندر کانت نے ایک گاڑی فروخت کر دی۔ پھر اسے فیکٹری بھی رہن رکھنا پڑی۔ مگر بات بگڑتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ دوسری گاڑی بھی جاتی رہی۔

ادھر بچے بڑے ہو رہے تھے۔

وہ پریشان رہنے ہی لگا تھا کہ اس کی بیوی نے جو بہت پہلے زنانہ لباس کی تراش خراش میں ڈپلومہ کر چکی تھی، زیورات کے بدلے رقوم
حاصل کر کے ایک اعلیٰ درجے کے کاروباری علاقے میں شوروم کھول لیا۔ ان دنوں مغربی طرز کے زنانہ ملبوسات کی مانگ تھی اور یہ بات اس نے ذہن میں رکھی۔ شوروم چل نکلا۔ ریشمی شلوار سوٹ الماریوں میں بند کر کے وہ خود بھی وہی لباس پہننے لگی تھی۔

برسوں تقریباً چوبیسوں گھنٹے گھر پر شوہر کے ساتھ گزارتے وہ مطمئن سی جی رہی تھی کہ اسے اپنی دنیا سے باہر آنا پڑا۔ اور باہر کی دنیا بھی بری نہیں تھی۔ اسے اپنے گھر کی بنیادیں اور مضبوط معلوم ہوئیں، بچوں کا مستقبل اور محفوظ نظر آنے لگا۔ وہ جٹ گئی اپنے کام میں۔ وقت کے ساتھ اسے بھی اپنا طرزِ زندگی بدلنا پڑا۔ اپنے وزن کا خیال رکھنا لازمی ہو گیا کہ ایسے پہناوے فروخت کرنے کے لئے اُس پر اِن کا اچھا لگنا بھی ضروری تھا۔ اپنی مرضی سے بجنا سنورنا اسے اچھا لگنے لگا کہ پہلے وہ صرف شوہر کی پسند سے سجا کرتی۔ اُسی کی پسند کے گہرے چمکیلے رنگ، طرزِ لباس وغیرہ اس کی اپنی پسند بن گئے تھے مگر اسے اس بات کی غالباً خبر ہی نہ تھی۔ یہ دریافت اسے دلچسپ معلوم ہوئی کہ وہ ہلکے رنگ پسند کرتی ہے۔ قمیص شلوار دوپٹے کی نسبت مغربی پہناوے میں زیادہ آسانی سے کام کر سکتی ہے۔

چندر کانت کو پہلے بھی گھر میں رہنا اچھا لگتا تھا، اب بھی۔ مگر اب وہ گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ ٹیلیوژن دیکھتا رہتا۔ کئی دفعہ اس کا جی چاہتا کہ اس کی بیوی کچھ دیر بعد جائے۔ مگر وہ جلدی

میں ہوتی۔ شوروم کھلنے کا وقت نکلنے کا خدشہ ہوتا اور رُک نہ پاتی۔ یہ بات چندر کانت کو بالکل پسند نہ تھی۔

اس نے شراب کچھ زیادہ مقدار میں پینا شروع کردی تھی۔

بالکنی پر کھڑے چندر کانت ناگپال کو شراب کی طلب ہونے لگی۔ حالانکہ وہ صرف رات کو پیا کرتا تھا اور ابھی صبح کے تقریباً گیارہ بجے تھے۔ آج بھی وہ گھر میں اکیلا تھا۔ کل شوروم کی چھٹی تھی تو سارا دن اس کی بیوی اس کے سامنے تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اس کی بیوی کبھی شوروم نہ جائے۔ بلکہ صبح جب وہ تیار ہو رہی تھی تو اسے ایک سیکنڈ کے کسی حصے میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شوروم میں آگ لگ جائے اور دن بدن مزید جاذب ہوتی جا رہی اس کی بیوی اس کی نظروں کے سامنے رہے۔

مگر شوروم میں آگ نہیں لگی الٹا مزید روشنی کا انتظام ہو گیا۔

کچھ روز پہلے مسز ناگپال نے اپنے شوروم کی خاطر نئی 'ڈمیز' کے لئے اشتہار دیا تھا، کیونکہ اس کی خواہش کے مطابق ایسی 'ڈمیز' مارکیٹ میں دستیاب ہونا ممکن نہ تھا۔ پلاسٹک کی ایسی گڑیاں جو 'ریپر آنز' اور 'لانگ سکرٹس' کی نمائش کے کام آسکیں۔ اور جن کی ساخت جل پریوں سی ہو۔ پیروں کی جگہ مچھلی کا نچلا دھڑ مختلف رنگوں سے سجایا گیا ہو۔

اشتہار کے جواب میں ایک دلچسپ اور سودمند تجویز آئی۔

''ہماری لڑکیوں کو 'ایکسپوجر' ملے گا اور ہمارے مشہور 'بینر' تلے آپ کے 'ڈیزائنز' کی 'ماڈلنگ' ہوگی۔''

آفر پیش کرنے والے سینتیس اڑتیس سالہ طویل قامت، خوش لباس اور گہری

گہری آنکھوں والے شخص نے 'دی مرمیڈ' شوروم کے سفید مرمری کاؤنٹر کے دوسری جانب کھڑی سنہرے بالوں والی خوب صورت لڑکی سے مسکرا کر کہا۔ کاؤنٹر پر جس جگہ اس نے اپنی گوری سی کہنی ٹکائی تھی، وہاں 'دی مرمیڈ' کے کاروباری 'ٹریڈ مارک' میں جہاں انگریزی سے لکھے 'مرمیڈ' کا 'آئی' لکھا تھا، کسی روپہلی دھات سے ننھی سی جل پری بنائی گئی تھی اور 'آئی' کے اوپر والے نقطے کی جگہ جل پری کے سر پر سنہرے رنگ کا تاج بڑی مہارت اور نفاست سے جوڑا گیا تھا۔

"سوچ لیجئے میم! ایسا آفر مشکل سے ملتا ہے۔" اس نے جیسے کہ سرگوشی میں کہا۔

"ہماری 'سلم اینڈ سمارٹ' ماڈلز، آپ کے اس ٹریڈ مارک کے ساتھ سچ مچ کی مرمیڈز نظر آئیں گی۔ حسین چلتی پھرتی جل پریاں۔ آپ ہماری بات کرایئے نا 'اونر' کے ساتھ۔"

"آپ بیٹھئے۔" لڑکی نے ایک طرف رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"میں جگنو کو بلاتی ہوں۔ وہی دیکھتی ہے یہ سب۔" اس نے دوسری طرف کے کاونٹر کے قریب ایک لڑکے کو کچھ اشارہ کیا جو کسی گاہک کو 'پُل اوورز' دکھا رہا تھا۔

جگنو اس کاروبار میں ماہر تھی۔ ہنستی مسکراتی کہیں سے آن پہنچی۔

"ہئے۔۔ مائی سیلف جگنو۔۔۔" وہ ہونٹ بھینچ کر مسکرائی۔

"او ہیلو۔۔ آئی ایم شوکمار شریواستو۔۔ لوونگلی کالڈ شوشری۔۔۔ یعنی آپ مجھے شو شری بلاسکتی ہیں۔" اس نے گرم جوشی سے مسکرا کر ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھایا۔

"ایک عمدہ آفر ہے میم۔۔" اس نے آفر دہرایا۔

"'بھئی ویسے' نفع تو ہوگا ہی کچھ۔۔۔ اس پر دونوں کمپنیز کا برابر کا حق ہوگا۔"

"یہ بات آپ نے پہلے نہیں بتائی۔۔" کاؤنٹر کے عقب میں کھڑی لڑکی مسکرا کر بولی۔

'' اس لئے کہ یہ بات جگنو جی ہی سمجھ سکتی ہیں۔'' وہ ہنسا۔

'' مگر آپ بھی ہماری موڈلز میں شامل ہو سکتی ہیں۔'' وہ ہنسا۔

'' او نو۔ شوشری۔۔ یہ تو اونر ہیں ہماری۔ اس شوروم کی مالک۔۔'' جگنو جلدی سے بولی۔

'' او مائی مائی۔۔۔۔ یعنی۔۔ یعنی کہ مسز روہنی ناگپال۔۔'' وہ بشاشت بھری حیرت سے بولا۔

''جی ہاں۔۔ وہ ان کی بٹیا بھی آ رہی ہیں۔۔ '' جگنو بھی مسکرائی۔

سکول کی وردی میں ملبوس ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی اسی طرف آ رہی تھی۔ اس نے لمبی سی پٹی والا کتابوں کا بیگ کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔

اس کی صورت روہنی سے خاصی شباہت رکھتی تھی۔

'' اوہ۔۔ یعنی بال وِواہ۔۔۔'' اس نے سنجیدہ صورت بنا کر جیسے کہ افسوس سے سر ہلایا تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

'' ہیلو بیٹا۔۔'' شوکمار شریواستو نے ہاتھ بڑھایا۔

'' آئی ایم شوشری۔۔ دے مرمیڈز نیو پارٹنر۔۔''

''او ہائے انکل۔۔ آئی ایم منی ۔''

''ٹمپرری پارٹنر ۔۔ آئی مین۔۔'' وہ مسکرایا اور پھر سنجیدہ صورت بنالی۔

''بٹیا کی شادی کی بات تو نہیں چل رہی ہے نا ۔۔۔ ؟'' اس نے ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر پوچھا۔

''ایکس کیوزمی۔۔؟'' منی کچھ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

اوکم آن شوشری۔۔۔'' جگنو ہنسی۔

'' آئی مین۔۔ یو نو وٹ آئی مین۔۔'' وہ بھی ہنسا۔

''کافی پی جائے۔'' روہنی نے کافی کی طرف اشارہ کیا اور ہلکے سے مسکرا دی۔ ایک سمارٹ سا نوعمر لڑکا کافی کے پیالوں والی کشتی ہاتھوں میں تھامے مؤدبانہ کھڑا تھا۔

فیشن شو واقعی 'ہٹ' ثابت ہوا۔ مگر شراکت عارضی ثابت نہیں ہوئی۔ 'دی مرمیڈ' کو مزید 'آفرز' ملے۔ کام پھیلتا گیا۔ شوکمار شریواستو اچھے دوست کی طرح نیک مشورے دیتا جو سودمند ثابت ہوتے۔ بلکہ اب رفتہ رفتہ 'دی مرمیڈ' کے ہر مسئلے کا حل شوکمار شری واستو کے پاس ہوتا۔ کاروبار ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔

پھر ایک دن روہنی ناگپال نے گاڑی خرید لی۔ بچے جو گاڑیوں کے اچانک چلے جانے سے ٹیوشن وغیرہ کے لئے آٹو رکشا سے کام چلاتے تھے، نہ صرف بوکھلا گئے تھے بلکہ اپنی خام عمر کے باعث اندیشہ ہائے دوردراز میں مبتلا بھی تھے۔

اس شام گھر پہنچنے پر روہنی نے نئی گاڑی کی چابی شوہر کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''مام۔؟ نیو کار؟'' راہل کی خوشی اور حیرت میں ڈوبی آواز چیخ کی طرح ابھری۔

''یس۔ مائی چائلڈ۔'' روہنی مسکرائی۔

'' اَوَر نیو کار۔'' منی نے تالی بجائی تو راہل نے ماں کو گود میں اٹھایا اور ایک دائرہ گھما کر نیچے رکھ دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنستی رہی۔ راہل نے

لپک کر باپ کے ہاتھ سے چابی لی اور باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے منی اور پھر روہنی تھی۔ نکلتے وقت روہنی نے پلٹ کر شوہر کو دیکھا تھا اور شاید بلایا بھی تھا۔ مگر بچوں کی خوشی میں شرکت اسے شوہر کو اسرار کر کے لانے میں مانع ہوگئی اور وہ گاڑی میں ایک ڈرائیو لینے نکل گئے۔

وہ تینوں ماں بیٹے جب سرشار سے گھر پہنچے تو چندرکانت جیسے کہ سکتے کے عالم میں اسی صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ جیسی کسی شے کے کوئی آثار نہ تھے۔ منی آ کر

باپ کے برابر بیٹھ گئی۔

''تھینکس ماما۔ بہت مزا آیا پاپا۔ آپ نہیں آئے۔'' اس نے جیسے کہ روٹھتے ہوئے کہا۔

''کل چلیں گے گھومنے۔۔'' رونی نے چندر کانت کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''ہے نا۔۔'' وہ بولی۔

''دیکھتا ہوں ۔۔ اگر۔۔ وقت ہوا تو۔۔'' وہ بمشکل بولا۔ فوراً ہی اسے لگا کہ اس نے کچھ غلط کہہ دیا۔

''میرا مطلب ہے اگر۔۔ مُوڈ ہوا تو۔۔''

رونی نے اس بے تعلقی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

''جانتی ہو بہت مائیلج دیتی ہے۔۔'' راہل منی سے کہہ رہا تھا۔

'' 'بلؤ ویلویٹ' کے 'کور' چڑائیں گے 'سیٹس' پر۔'' منی بولی۔

''بلؤ۔۔ ویل ۔۔ ویٹ۔۔۔'' راہل نے ایک ایک لفظ کھینچ کر کہا۔

''کیوں کہ تیرا 'فیورِٹ کلر' ہے۔۔ میرا کیوں نہیں 'میرُون'۔۔'' پرانی دونوں گاڑیوں میں الگ 'کلرس' تھے نا۔۔'' وہ کچھ سنجیدہ سا ہو گیا۔

''دوسری بھی آجائے گی۔۔۔ آئی ہوپ۔۔ تم لوگ اپنے پڑھنے میں دھیان لگاؤ بیٹا۔۔۔ ۔اینڈ سٹاپ وریئنگ۔۔۔ کسی قسم کی کوئی فکر کرنا تم لوگوں کا کام نہیں ہے۔۔ رائٹ؟''

''یس مام۔۔۔'' دونون نے ساتھ ساتھ کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

رونی نہانے چلی گئی۔

وہ نہا کر لوٹی تو چندر کانت کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

''آیئے نا کہیں گھوم آئیں۔۔ بہت پہلے کی طرح۔۔ جب آپ نے مرسیڈیز لی تھی۔۔ اور ہم دونوں۔۔'' رونی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی چندر کانت کھڑکی سے ہٹ کر فون کی

جانب لپکا۔
''یہ تمہاری گاڑی ہے میری نہیں۔۔''اس نے مُنہ پھیر کر کہا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔روہنی کچھ لمحے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔پھر اس کے ابروئں کے درمیان ایک دو طویل سی لکیریں کھنچ گئیں جنہیں اس نے سر جھٹک کر بھگا دیا اور بچوں کے کمروں کی طرف چلی گئی۔

دوسری صبح جب روہنی شوروم جانے لگی تو چندر کانت نے اس کے 'بائے' کہنے کا جواب نہیں دیا۔اور ہونٹ بھینچے اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگا۔
''یہ جینز۔۔ یہ ٹاپ ۔۔یہ کیا ڈریس پہننے لگی ہو تم۔۔ 'ولگر' لگتی ہو ان کپڑوں میں۔''
''آپ بھی حد کرتے ہیں۔۔ویسٹرن آؤٹ فٹس کا شوروم ہے میرا۔ساری یا سلوار سوٹ پہنوں گی تو کسٹمرس پر کیا امپریشن پڑے گا۔ویسے انڈئین ڈریسز رکھنے کا بھی ارادہ ہے میرا کچھ وقت بعد۔۔پھر خود بھی پہنوں گی۔۔'' روہنی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔
''اور ولگر کیوں کہا۔۔''اس کی آواز میں گلہ شامل ہو گیا تھا۔
''تو اور کیا کہوں۔۔ یہ ہماری سبھتا نہیں ہے۔تمہاری عمر کی عورتیں تو۔۔تم تو منی جیسے کپڑے پہننے لگی ہو۔'' روہنی کی شکوے بھری آواز اس کے لہجے میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکی۔
''کتنے کروویل ہو تم۔۔''روہنی نے آہستہ سے کہا اور باہر نکل گئی۔

شوروم میں شوکمار شری واستو اور جگنو مرمریں کاؤنٹر کے اُسی کونے کے قریب کھڑے تھے جہاں 'دی مرمیڈ' کا سفید اور سنہرا 'لوگو' نصب تھا۔یعنی طلائی تاج والی نقرئی جل پری بڑی ادا سے ایستادہ تھی۔وہ دونوں بڑی سنجیدگی سے کوئی بات کر رہے تھے،روہنی کو دیکھا تو اسی کی طرف بڑھے۔
''ارے۔۔یہ اداس صورت۔۔؟ کیا معاملہ ہے۔''شوکمار شری واستو جلدی سے بولا۔

"کیا ہوا میم ۔۔" جگنو نے تشویش سے کہا۔

"کچھ نہیں۔۔" وہ جیسے کہ بمشکل بولی اور اپنی نشست پر جا بیٹھی۔

"ہم تو آج ایک فینٹاسٹک آئیڈیا لے کر آئے تھے۔۔ "شوکمار شرواستو نے کہا۔

"مگر آج آپ اداس ہیں۔۔ اس لئے آپ کے دماغ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔۔ ویسے 'یو نو سمتھن '۔۔۔؟" وہ سر اثبات میں ہلا کر ہلکے سے مسکرایا تو رونی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"یو لُک گورجئیس ان براؤنز ۔۔ویسے بھورے رنگ کے سارے 'شیڈس' آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔۔ ہیں نا۔۔ باوقار لوگوں کی پسند۔۔۔" شوکمار شریواستو کی آواز میں ہلکی سی اداسی تھی۔ یا شاید رونی کو ہی ایسا محسوس ہوا ہو۔

اس نے نظر اٹھا کر اسے پل بھر دیکھا۔ اور پھر میز کی دراز کھولکر اس میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔

ایک تصویر پر اس کی نظریں ٹھہری رہ گئیں۔ کسی عمدہ مکان کے باغیچے میں کرسی پر بیٹھی ایک پروقار سی ادھیڑ عمر خاتون کی گود میں ایک پانچ چھ سالہ صحت مند بچہ مسکرا رہا ہے اور کرسی کے قریب عورت کے گھٹنے کا سہارا لئے کھڑی ایک ننھی سی قدرے چھوٹی اور دبلی بچی کچھ روٹھی سی کیمرے کو دیکھ رہی ہے۔

رونی کئی لمحے تک تصویر کو دیکھتی رہ گئی۔

مکان اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ بڑے سے باغیچے میں چھوٹے چھوٹے پیروں سے بھاگتی منّی سی لڑکی بھی۔

اتنے بڑے مکان میں صرف تین مکین تھے۔ منّی سی بچی کے والد اور دادی ماں۔

اسکی جلد ماں کی طرح ہی سنہری سی رنگت لئے تھی۔ اسنے کئی دفعہ گھر میں یہ بات سنی تھی۔ حالانکہ اس بات سے پھوپھی بالکل خوش نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن ماں اس کی کم عمری میں ہی

دنیا سے چلی گئی تھی۔ اور منّی سی بچی کم عمری سے ہی باتیں اچھی طرح سمجھتی تھی اور دیر دیر تک ان پر سوچا کرتی تھی۔

اس کی پرورش دادی ماں نے کی تھی۔ مگر برابر کے گھر میں رہائش پزیر اس کی پھوپھی بھی اکثر سارا سارا دن انکے گھر میں گزارا کرتی تھی۔ اور اسکے ساتھ سنی بھی آتا تھا۔ وہ اس سے بڑا تھا پھر بھی دادی ماں اسے گود میں لئے لئے گھومتیں۔ جب کہ اس کی اپنی ممی بھی تھی۔

دادی ماں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

منّی سی لڑکی سوچوں میں کھو جاتی۔

پہلے پہل جب وہ اور بھی چھوٹی تھی تو بول ہی نہیں سکتی تھی۔ کیسے دادی ماں کو انکی غلطی کا احساس دلاتی۔ اور جب اسے بولنا آ گیا تو بھی اسے بولنا نہ آیا۔ ایک تو سنی اسے مارتا تھا دوسرے دادی ماں کی گود سے کھینچ کر اتار دیتا اور خود جا چڑھتا۔ دادی ماں اسے ایسی بری بات پر بھی نہ مارتیں۔ بس کہتیں کہ ایسا نہیں کرتے، اور وہ بھی ہنس کر۔ پھر بھلا اتنی چھوٹی سی وہ لڑکی انہیں کیا سمجھاتی۔ اور پھوپھی تو بالکل اچھی نہ تھیں انہیں تو سمجھانے کی کوشش کرنا ہی بیکار تھا۔ بس ایسے میں وہ چپ چاپ روتی تھی۔ جب بابا کی چھٹی ہوتی تو کہیں گھومنے کا پروگرام بنتا، مگر اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا کہ سنی وہاں بھی ساتھ ہوتا۔ اور جب بابا اسے گود میں لیتے تو پیچھے پڑ جاتا کہ اسے ہی اٹھایا جائے۔ اگر بابا زرا سا کہہ دیتے کہ ابھی لیں گے تو روتا ہوا جا کر دادای ماں کی گود میں چڑھ کر کھی کھی کر کے ہنستا اور چھوٹی سی لڑکی کا منہ چڑاتا۔ پکنک کا سارا مزا خراب ہو جاتا۔

کبھی بابا سے اسکی شکائت کرتی تو وہ کہتے کہ وہ کچھ دن بعد انگلینڈ جائے گا تو سب لوگوں کا پیار صرف اسی کو ملے گا مگر بہت سارے سال گزر گئے، وہ گیا ہی نہیں۔ وہ بہت دن تک سوچتی رہی۔

بڑی مشکل سے جب کہیں سنی کے لندن جانے کا وقت آیا تو اس وقت چھوٹی سی لڑکی بڑی ہو گئی تھی۔ وہ خواتین کے کالج میں طالبہ تھی۔ دبلی پتلی ہو کر بھی اسکا چہرہ بھرا بھرا سا تھا۔ ایکدم گول سا ہو گیا تھا۔ اسے یہ سب معلوم نہیں تھا، لڑکیوں نے بتایا تھا۔

پھوپھی بضد تھی کہ گریجویشن کے بعد اسکی شادی کرادی جائے۔ کہتی تھی بن ماں کی بچی ہے کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو لوگ ہمیں الزام دیں گے۔ ہماری تربیت میں نقص نکالیں گے۔ ہم منہ دکھانے لائق نہ رہیں گے۔

اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ سکول میں زرا بھی وقت ملتا، کتب خانے میں جا بیٹھتی۔

۔۔آپ سب کے مسئلے حل کر دیتے ہیں۔۔ میرے کیوں نہیں۔۔ میں نے کچھ غلط سوچ لیا کیا۔۔ اس دنیا کو جاننا چاہتی ہوں۔۔ اگر مجھے کوئی بتائے تو۔۔ کوئی انسان۔۔ یا کتابیں ۔۔کوئی غلط ہے ایسا چاہنا۔۔

فصیل بند شہر پانی پت کے پندرہ دروازوں سے ہر راستہ اس شکستہ مگر پرشکوہ قلعے کی اور جاتا تھا جس کے برابر میں تقریباً سات سو برس پرانا ایک، مزار تھا۔ صوفی بزرگ شاہ قلندر کا۔

اس نے اداسی کم کرنے کا اپنے تئیں ایک آسان طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ خواجہ کی دہلیز کا بوسہ لے کر وہ ایک طرف دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتی اور آتے جاتے لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ لاشعور میں غالباً اس کے اپنے مسئلے ابھرتے ڈوبتے رہتے۔

ایک سکھ نوجوان سلیٹی رنگ کا صافہ باندھے سلیٹی واسکٹ کے اندر کرپان لٹکائے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ خواجہ کا آشیرواد لینے حاضر ہوا تھا۔ اسکے ساتھ سر پر گوٹے کناری والی چنری اوڑھے چاند سے چہرے والی ایک نوعمر لڑکی مہندی رچے ننگے پیروں کو سنبھل

سنبھل کر فرش پر دھرتی ہاتھ جوڑے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔

سیاہ قمیص پائجامہ پہنے ایک لمبے قد اور چھوٹی داڑھی والا لڑکا مزار کی چادر تھامے سر جھکائے زار و قطار رو رہا تھا۔ اسکے سر پر قروشئے سے بنی گئی سفید ٹوپی تھی جس کے نیچے سے اس کے گھنے بال گویا بغاوت کر کر کے ماتھے پر آجاتے تھے جنہیں ٹوپی کے اندر کی طرف سنوارنے کے بہانے وہ آنسو پونچھ لیتا تھا۔

پتلون پہنے دو سفید فام سیاح خواتین سروں پر چھوٹے چھوٹے رومال باندھے، کیمرے گلے میں لٹکائے پرسکون نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھ رہی تھیں۔

اگر اسے پڑھنے نہ دیا گیا۔۔تو۔۔وہ کیا کریگی۔۔

اپنے محبوب مضمون کے بحرِ بے کراں کے کسی کنارے تک کیسے پہنچے گی۔۔

اس نے کچھ نیا سوچ رکھا تھا۔۔ایک ایسا کام جو اس سے پیشتر شاید ہی کسی نے کیا ہو۔۔ دیانت داری سے تاریخی حقائق کا بیاں ضرورت سے کتنا کم ہوا ہے۔۔وہ ایسی تاریخ لکھے گی جو کسی قومی، مذہبی، مسلکی یا کسی گروہ کے موقف میں نہ ہو۔۔۔ بلکہ ایک سچی اور کھری تحقیق پر مبنی ہو۔۔اسے واقعات کو گلیمرایز یا فکشنایز نہیں کرنا ہے۔۔مگر تاریخ کا یہ لازمی حصہ۔۔یعنی خون خرابہ ۔۔

کیا کیا اصطلاحات گڑھ رکھی ہیں لوگوں نے۔۔ان بہت سے تاریخ دانوں نے۔۔

جنگِ عظیم۔۔

گھمسان کی لڑائی۔۔

کشتوں کے پشتے۔۔

خون کی ندّیاں۔۔

یعنی پانی جیسی شفاف اور روح پرور چیز۔۔اور بہتے خون کا خوفناک منظر ۔۔

سروں کے مینار۔۔

خون سے میدان لالہ زار۔۔۔یعنی پھول اور خون۔۔

اپنی جان کو دنیا کی ہر شے سے عزیز رکھنے والے انسان کو دوسروں کے بریدہ سر کاغذ کے صفحات پر سجانے میں زرا تعمل نہیں۔۔جنگ جیسی شے اگر لازمی ہے تو اس کی ان جزیات کا بیان انسان اس طرح کیسے کرسکتا ہے۔۔

کیسی کیسی تشبیہات دی گئی ہیں کہ۔۔۔خون ریزی کے ذکر سے لطف اندوز ہونے کی کوشش یہ انسان ہی کر سکتا۔۔ خون بہانے والا شر پسند انسان۔۔اقتدار کا دیوانہ انسان۔۔طاقت کا شیدائی انسان۔۔حکومت کرنے کے لئے جان لینے والا انسان۔۔

وہ ایسے نہیں لکھے گی۔۔اسے کوئی زیادہ سے زیادہ قاری بٹورنے یا چونکانے کے لئے تھوڑے ہی لکھنا ہے۔۔اسے بس سچ لکھنا ہے۔۔

اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔۔

اس نے ایسی اپنایت بھری نظروں سے مزار کی جانب دیکھا جیسے شاہ قلندر اس کی بات سن کر مسکرائے ہوں۔

ایک جملہ بھی نہیں۔۔یوار آنر

ایک لفظ بھی نہیں۔۔یوئر۔۔آنر۔۔

وہ خود بھی مسکرا دی۔

اسے، تاریخی حیثیت سے عظیم، اپنے اس شہر پانی پت کی تاریخ سے شروعات کرنا ہوگی۔۔تاریخی عظمت کی شروعات۔۔یعنی تاریخ کا ایسا کارنامہ کہ جس دور میں انسان نے ترقی کی ۔۔امن وامان سے رہا ہو۔یعنی جنگ وجدل کے بغیر باقی سب۔۔مگر کوئی کسی ملک پر حملہ کرے گا تو۔۔تو کیا وہاں کا سلطان تھوڑی اپنی سلطنت اس کے حوالے کر دیگا کہ آ، بھائی تیرا ہی انتظار تھا۔۔اور مجھے اپنی غلامی میں کوئی مقام عطا کر۔۔

وہ زیرِ لب مسکرا دی۔

مگر ایسی مثالیں بھی تو ہیں نا کہ۔۔

ہاں جب حملہ آور کے پاس ایسی طاقت ہو کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکے تو دانش مند لوگ بغیر انسانی جانیں ضائع کیے خود سپردگی کر دیتے ہیں۔۔

کیوں آیا تھا بابر، ابراہیم لودھی سے ناخوش امیروں وزیروں اور رشتہ داروں کی دعوت پر لڑنے۔

اگر ابراہیم لودھی نے بابر کے آگے ہتھیار ڈال دئے ہوتے۔ اس کی لاکھوں کی فوج بابر کے بارہ ہزار فوجیوں سے ہار گئی کہ بابر نے بندوق کا استعمال کیا تھا۔ اس سرزمین پر پہلی بار گولی بارود۔۔ اور اس کے پاس کتنی ہی ہاری اور جیتی ہوئی جنگوں کا تجربہ تھا۔۔

لڑکی کی نظر سے کل ہی کسی کتاب میں اس بات کی مزید تفصیل گزری تھی۔

فرغانہ اور آخسی کے حکمراں اور اپنے والد عمر شیخ کی اچانک وفات سے نوعمر تخت نشیں بابر کو ایسے کاموں یا کارناموں میں کہاں دلچسپی تھی۔۔ جو وقت نے اس کے سپرد کر دی۔

اور پھر اچھا بھلا تو تھا وہ اپنے اندجان، اپنے سمرقند و بخارا، تاشقند و ہرات جیسے مقامات کو آتا جاتا جیتتا ہارتا۔۔ دریائے 'قوا' کے آر پار رہتا۔۔ گھوڑی کے دودھ کا 'قمیز' پی کر تازہ دم رہتا۔ نثر نگار بابر۔۔ شاعر بابر۔۔ کسی۔۔ قارہ کوز، یعنی سیاہ چشم۔۔ کسی سیاہ چشم حسینہ کے ساتھ۔۔ زندگی گزار لیتا۔۔ اپنے حرم سے مطمئن۔۔ خون خرابے سے دور۔۔ مگر۔۔ تخت کی ذمے داریاں ۔۔ طاقت کے تقاضے۔۔ حکومت کے تقاضے ۔۔ حکومت کا نشہ۔۔

مغل بادشاہ کہا جاتا ہے اسے۔

اسے تیموری کہلانا پسند تھا۔۔ مغلوں سے اس کی لڑائی رہتی تھی۔۔ اور ہمارے یہاں وہ

دورِ مغلیہ دور کہلایا۔۔ کیوں۔۔اسے یہ سب تحریر کرنا ہوگا۔۔
وہ سب لکھے گی۔۔ منفی بھی اور مثبت بھی۔
اسی کے شہر میں لڑی تھی اس نے لڑائی۔۔ پانی پت کی پہلی لڑائی۔
وہ کھڑی ہوگئی۔اس نے خواجہ کے مزار کی سیاہ مخملی چادر پر الوداعی نظر ڈال کر پرنام میں ہاتھ جوڑے اور چار پیچھے الٹے قدم اٹھاتی واپس مڑ گئی۔

اس کے بعد اس نے کسی طرح اپنے والد کو منا کر کچھ وقت اور پڑھنے کی اجازت حاصل کر لی ،مگر مضامین اس کی خواہش کے مطابق نہ ہو کر اس کی پھوپھی کی مرضی کے تھے۔۔
کل کو یہ ہنر اس کے کام بھی آسکتا ہے۔تاریخ پڑھ کر اس کا کیا بھلا ہوگا۔
پھوپھی نے جواز دیا تھا۔اور دادی ماں نے بھی تائید کی تھی۔
سَنی باہر نہ گیا ہوتا تو اسے سرے سے آگے پڑھوانے ہی کی مخالفت کرتا۔اس کی غیر حاضری میں پڑھنے کی اجازت مل جائے۔۔ کچھ بھی۔۔تاریخ تو اس کا شوق ہے اسے پورا کر ہی لیگی کسی طرح۔۔
وہ سوچا کرتی۔۔
پھر بابا کو اس پر وشواس رکھنا چاہئے تھا۔ یہ اونچ نیچ کیا ہوتی ہے۔سکول بھی تو کتنا دور تھا۔کبھی کبھی جب ڈرائیور بھی نہیں ہوتا تھا۔۔سنی اور بابا دونوں ہی مصروف ہوتے تو۔۔اکیلی ہی تو آجاتی تھی وہ بس یا آٹو رکشا پکڑ کر۔۔اور کسی دن تو کوئی لڑکی بھی نہ ہوتی تھی اس کے ساتھ۔۔اونچ نیچ۔۔کسی سے ایک غیر ضروری بات تک نہ کی تھی اس نے کبھی۔۔کتنا مصروف اور بھیڑ بھاڑ والا شہر ہو جاتا تھا سکول کے اوقات میں۔۔ کاروباری اداروں سے بھرا شہر۔۔ٹرکوں میں سامان آجا رہا ہے۔۔کپڑے اور اُون کی مصنوعات۔۔کہیں فوجیوں کے لئے کمبل جا رہے ہیں۔۔ کہیں بستروں کی آرائش کے سامان سے لدا

ٹمبو۔۔ کہیں قالین ۔۔ غالیچے۔۔کہیں رنگ برنگے اون کے بیشمار نرم نرم گولے پالیتھین کی شفاف تھیلیوں کے عقب سے جھانکتے ،ڈبوں میں ٹھنسے گاڑیوں میں بھرے ہیں۔اوراس کی علاوہ اور بھی جانے کیا کیا۔۔اور ملک کے نہ جانے کون کون سے کونے سے روزگار کی تلاش میں آئے لوگ۔ کارکن ،تکنیکی ماہرین، انجینیئر۔۔الگ الگ صورت والے،جدا جدا رنگت والے۔۔مختلف زبانیں بولنے والے۔۔مختلف قد کاٹھی کے۔۔اور کہتے ہیں کہ۔۔ان کی تربیت۔۔اور وہ کیسے تباہ ہوں گے۔۔

اسے ہنسی آجایا کرتی تھی کبھی کبھی سوچتے ہوئے۔۔وہ پانی پت کی چوتھی لڑائی لڑنے جارہی تھی کسی کے ساتھ کیا۔۔

اسے اس بات پر زور سے ہنسی آئی اور کچھ دیر اس کے ہونٹوں پر ہی ٹکی رہی۔

کہتے ہیں مہابھارت کی لڑائی میں دریودھن نے جن پانچ گاوؤں کی مانگ کی تھی ان میں ایک۔۔ پن پت تھا جو بعد میں بگڑ یا سنور کر پانی پت ہوگیا۔۔یعنی سنور کر۔۔پن پت کیسا عجیب لگتا ہے کہنے میں۔۔سوچتے سوچتے وہ ہلکے سے مسکراتی۔۔ مگر کیا معلوم عجیب نہ لگتا۔۔اگر ہمیں پن پت کہنے کی عادت ہوتی تو پانی پت کہنا عجیب لگ سکتا تھا۔۔جنگ سے پرانا رشتہ ہے اسکے اس شہر کا۔۔اکبرِ اعظم نے ہیمو سے لڑکر اپنے راج کو اور مظبوط کر دیا تھا۔۔پھر احمد شاہ ابدالی مرہٹوں سے لڑا اور مرہٹے ہار گئے تھے۔۔ان تین بڑی۔۔یعنی خطرناک جنگوں نے ہندوستان کی تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ تین جنگیں نہ ہوئی ہوتیں تو اس ملک کی تاریخ کیا ہوتی۔۔اس نے پل بھر کو سنجیدگی سے سوچا۔مگر اسے اپنا یہ خیال ایسا بے تکا محسوس ہوا کہ وہ دوبارہ ہنس دی۔۔۔

کاش وہ۔اس سب کو کاغذ پر اتار سکتی۔۔

وہ سنجیدہ ہوگئی۔

خیراب ایک جنگ --ایک اور جنگ اسے لڑنا ہوگی۔ ان سب سے جو یوں ہی اسے--جس سے اس گھر کے مکینوں کو زرا عقل آئے--اور یہ سمجھ جائیں --کہ--نہیں وہ ثابت کر دے گی کہ اسے خود کو سنبھالنا ان سے بہتر طرح آتا ہے اور کوئی اونچ نیچ کا اسکا کوئی ارادہ نہیں ہے ۔ اور تھا بھی تو نہیں --پھر--؟ بلا وجہ--!

اس دن انسٹیٹیوٹ میں اس کا غالباً تیسرا دن تھا۔جس بس سٹاپ پر اینسٹیٹیوٹ کی بس آنا تھی وہاں اِدھر اُدھر اور لوگ بھی منتظر کھڑے تھے۔سکول کا بستہ لئے ایک چھوٹے سے بچّے کے ساتھ ایک نوجوان سکول بس کے انتظار میں کھڑا لڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا تھا۔لڑکی اس طرح کے کسی واقعے سے اس وقت تک دوچار نہ ہوئی تھی اور یہ بات تو اسے لڑکیوں نے بتائی بھی نہ تھی، بس سٹپٹا کر رہ گئی۔آخر کسی طرح بس آئی اور اس نے سکھ کا سانس لیا۔

مگر سکھ کا سانس کچھ عارضی ثابت ہوا کہ اگلے دن نوجوان پھر اسے دیکھ رہا تھا۔لیکن بچے کی بس جلد آ گئی اور وہ نوجوان چلا گیا۔

اسکے بعد ہفتے اور اتوار کی دو چھٹیاں تھیں۔اس کے ذہن سے یہ بات محو ہو گئی۔مگر پیر کے روز معاملہ کچھ اور مشکل نظر آنے لگا۔بچے کو بس میں بٹھانے کے بعد بھی نوجوان وہیں کھڑا اسے رہ رہ کر دیکھتا رہا اور وہ بظاہر سڑک کے اس پار آم کے بڑے سے درخت کے تنے کے پاس 'ہیلمیٹ' فروخت کرنے والے شخص کے پاس آتے جاتے خریداروں کو دیکھتی رہی اور بے خبر بنی اندر اندر الجھتی رہی۔ اس کے بعد سارا وقت وہ پریشان سی سوچوں میں گم رہی۔

اس نے ایک آدھ کلاس سے بھی ناغہ کر لیا۔ یہاں تک کہ اس کی ایک ہم جماعت اسے تلاش کرتی لائبریری کے اس کونے تک پہنچ گئی جہاں وہ 'ڈسکوری آف انڈیا' کا

وہ صفحہ کھولے بیٹھی تھی جو دو روز قبل اس نے آدھا پڑھا تھا۔اور جانے کتنی دیر سے آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہی تھی۔

''کیا سوچا جارہا ہے۔'' ہم جماعت اچانک بولی تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

'' میم پوچھ رہی تھیں تم کو بھائی۔یہاں کیا کررہی ہو۔کلاس نہیں چلنا کیا؟''

لڑکی خاموش اسے دیکھتی رہی۔

''کچھ بولو بھی تو۔۔ کیابات ہے۔۔''

''کچھ نہیں رادھیکا۔۔'' لڑکی کی اداس آواز ابھری۔

'' کچھ کیسے نہیں۔۔جلدی بتاؤ۔کوئی پرابلم ہوگی تو حل کرلیں گے۔ایسے بت کی طرح تمہارے چپ رہنے سے میں بھی پریشان ہوسکتی ہوں نا۔۔چلو باہر چلیں۔''

خاموش لائبریری سے وہ لوگ باہر آئے تو رادھیکا نے دیکھا کہ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو لبالب بھرے تھے۔اسنے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ہچکیاں لے کر رو پڑی۔

''رادھیکا اب میرا آگے پڑھنا مشکل ہے۔۔'' وہ مدھو مالتی کی بیل کے قریب پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئیں۔سامنے کنٹین سے کچھ طالبات
ضائع کردئے جانے والے گلاسوں میں چائے لے کر اسی طرف آرہی تھیں۔مگر دور سے انہیں کچھ اور لڑکیاں آتی نظر آئیں۔
انہیں دیکھ کر اس کے چہرے پر بیچارگی سی چھائی ہی تھی کہ انہیں دوسری طرف جاتے دیکھ کر وہاں اطمینان کی ایک لہر سی آکر چلی گئی۔

ساری بات سن کر پہلے تو رادھیکا کو ہنسی آگئی مگر پھر اس کے گھر کی فضا جان لینے کے بعد وہ بھی سوچ میں پڑگئی۔

''گھر میں بتادوں تو میرا باہر نکلنا تک بند ہوجائے گا، وہاں کسی کو سوائے حکم دینے کے

میری کہاں پرواہ ہے جو میرے شوق کے لئے میرا ساتھ دیں۔۔پڑھائی کا تو پھر سوال ہی نہیں۔۔اور اگر انہیں نہ بتاؤں تو یہ آدمی میرا جینا مشکل کر دیگا۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"مگر تم نے کیسے سوچ لیا کہ وہ کبھی تمہارا پیچھا ہی نہیں چھوڑے گا۔تم لفٹ نہیں دو گی تو اپنے آپ ہی باز آجائے گا۔"

"نہیں۔مجھے ایسا نہیں لگتا۔ مجھے تو ڈر سا لگتا ہے اس کے اس طرح ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جانے سے۔جیسے کہ اس نے پیچھا نہ چھوڑنے کی ٹھان لی ہو۔

"ضروری نہیں تمہاری بات سچ ہی نکل آئے۔۔"

"ہاں ہوسکتا ہے۔مگر پتہ نہیں کیوں مجھے۔۔۔کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔کیا کروں۔۔"

کافی سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ گھر میں خاموش اور بس سٹاپ پر قطعی لاتعلق رہنا ہی دانش مندی بلکہ مسئلے کا واحد حل ہے۔گو کہ مشکل مگر کارگر ہونے کی امید سے پُر۔

تاریخ کو اپنے اندر کہیں غالباً عارضی طور پر دفن کر کے اس نے انسٹیٹوٹ میں دل لگانے کی بھرپور کوشش کی۔

وہ بڑی محنت سے اپنی تربیّت جاری رکھے ہوئے تھی۔فیشن ڈِزائننگ کے کڈھائی والے پیریڈ میں اس کا دل لگ ہی جاتا۔

کبھی بغیر پتوں کی خمدار بیلوں کے ساتھ ننھے ننھے پھول جوڑ دیتی۔کہیں بغیر ڈنڈی کے بہت سی کلیوں کے درمیان برابر کی پتّیوں والا ایک بڑا سا پھول سجا دیتی۔ایک پوری آستین پر بے شمار ستاروں کی ساخت کی کڈھائی ہے تو دوسرے مونڈھے پر ایک دائرے میں کڈھے ستاروں کے درمیان بڑا سا نقشین بادام پھر بادام کے درمیان بہت سے ستارے۔اور اسی طرف گریبان کے آدھے حصے پر کچھ ستارے کچھ بادام۔ورنہ پھر

صرف دامن پر جیو میٹریکل ڈزائن والا بڑا سا پھول اور پھول سے لگے دو بڑے پتے جو بادام جیسے نظر آتے۔

تین برس کے ٹریننگ کورس کا دوسرا سال ختم ہونے والا تھا۔ دو برس میں مشکل سے ہی کوئی دن ایسا گزرا ہوگا جب اس نوجوان کی نظروں نے لڑکی کا تعاقب نہ کیا ہو۔ کبھی کبھی تو بچہ اس کے ساتھ غالباً سکول میں چھٹی کے باعث نہ ہوتا مگر وہ خود بس سٹاپ پر موجود نظر آتا۔ نوجوان نے اس سے بات کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی گو کہ اب لڑکی کو پہلے کی طرح اس کی موجودگی سے خوف نہیں آتا تھا۔ ادھر کبھی لڑکی کا جی چاہتا وہ پیارے سے ہنس مکھ بچے سے دوستی کر لے کہ سکول بس دیر سے آنے کی صورت میں اسنے کئی دفعہ لڑکی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا جسے لڑکی نے نوجوان کے رویتے کے باعث قبول نہیں کیا تھا۔ بس چپکے سے زرا سا مسکرا کر دوسری جانب سرک جایا کرتی تھی۔

اس دن چوتھے سیمسٹر کے امتحان کا پہلا دن تھا۔ لڑکی نے بس سٹاپ پر پہنچ کر چھاتہ بند کر دیا مگر سیمینٹ کی مختصری سیلنگ سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کے بال بھگونے لگے۔ جیسے ہی اس نے اوپر کی جانب دیکھا۔ ایک موٹا سا قطرہ ٹپ سے اس کی آنکھ میں آ گرا۔ اس نے جلدی سے چھتری سر پر تان لی۔ آس پاس ساری نشستیں خالی تھیں اور سیمنٹ کے بنچ نہ صرف بھیگے ہوے تھے بلکہ ان میں پانی بھی جمع ہو گیا تھا۔ کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہ کھڑی رہی۔ تین دن سے بے موسم کی بارش جیسے کہ کسی سازش کے تحت مسلسل برس رہی تھی۔ لڑکی کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ سڑکوں پر پانی بھر آیا تھا اور ابر کے پہاڑ نما دیو ہیکل ٹکڑے کسی بدمست ہاتھی کی طرح رہ رہ کر چنگھاڑ رہے تھے۔ صبح کے دس بجے کے وقت شام کا سا نیم اندھیرا چھا گیا تھا۔ سیاہ فام آسمان کی مسلسل گرج سے سنسان سٹاپ پر کھڑی لڑکی کی نظریں بے اختیار اپنی داہنی جانب اُٹھ گئی تھیں۔ آج پہلی بار

نوجوان بس سٹاپ سے غیر حاضر تھا۔سٹاپ کے مغرب کی طرف کنکریٹ کے ستون کے پاس لڑکی نے جس مقام پر اسے پچھلے دو برس تک بلا ناغہ کھڑا دیکھا تھا، آج خالی تھا۔لڑکی نے پل بھر کو ستون کی جانب دیکھا اور نظر دوسری طرف کر لی۔

اس دن پرچے کے دوران اس کی نظروں میں ایک آدھ بار ستون کا خالی احاطہ گھوم گیا تھا اور وہ دوبارہ کام میں مشغول ہوگئی تھی۔

امتحانات دو دو تین تین دن کے وقفے سے تھے، اس دوران نوجوان اسے بس سٹاپ پر نظر نہیں آیا۔اسے اس کا انتظار تھا، یا وہ اس کے نہ آنے سے پرسکون تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رزلٹ آنے میں ایک مہینہ تھا۔وہ بابا اور دادی ماں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کہیں پہاڑوں پر چلی گئی۔

(پھوپھی ان دنوں بیٹے سے ملنے لندن گئی تھیں۔)

پہاڑ پر چند ایک دفعہ اس کی نظروں میں خالی ستون اور بہت سی دفعہ ستون سے لگ کے کھڑا نوجوان گھوم گیا۔پتہ نہیں کس خیال کے تحت۔

جس شام وہ لوگ پہاڑوں سے لوٹے، اس نے ملگجی روشنی میں گھر کے پھاٹک سے کچھ دور اس نوجوان کو ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ بھی دبی تھی۔اسے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکی تھی۔لڑکی کو دفعتاً خیال آیا کہ اس سے پہلے اس نے کبھی اس کے ہاتھ میں سگریٹ نہیں دیکھی تھی۔ پھر اگلے پل وہ سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

دوسرے دن وہ بس سٹاپ پر موجود تھا۔ آج بچہ بالکل خاموش سا، نوجوان کی ٹانگوں سے لگا کھڑا تھا۔لڑکی نے آہستہ سے نظر بچا کر اسے دیکھا۔وہ بیحد کمزور نظر آرہا تھا۔پھر اس نے نوجوان کی طرف دیکھا تو وہ بھی کچھ پریشان حال سا نظر آیا۔لڑکی فوراً

دوسری جانب دیکھنے لگی۔نوجوان نے اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تھا، وہ اسکے قریب چلا گیا۔

''اس کی ماں۔۔نہیں رہی۔۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

لڑکی جو اتنے برس میں پہلی دفعہ اس کے اچانک مخاطب ہونے سے کچھ سٹپٹا سی گئی تھی ،اس کی بات سن کر ہکا بکا سی ایک آدھ سیکنڈ اسے دیکھتی رہ گئی۔ابھی اس نے بچے کی طرف گردن موڑی ہی تھی کہ اسکی بس آگئی ۔وہ بچے کی طرف دیکھتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی۔اس کا منہ ادھ کھلا تھا اور وہ بس میں بیٹھ کر بھی بچے کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔سٹاپ کا منظر جب پیچھے رہ گیا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔اس بات کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوں کی جھڑی لگ گئی۔

اس رات وہ سو ہی نہ پائی تھی اور اگلی صبح وقت سے کچھ پہلے ہی بس سٹاپ پہنچ گئی۔

نوجوان کے آتے ہی وہ بچے کے قریب چلی گئی۔جس وقت تک اس کی بس آئی وہ اس سے باتیں کرتی رہی۔اگلے دن بھی وہ بچے کے پاس چلی گئی۔رفتہ رفتہ اس کا معمول بن گیا کہ وہ صبح کچھ جلد جا کر بچے کے ساتھ وقت گزارتی۔بچہ کبھی جواب دیتا کبھی گم سم سا دیکھتا رہ جاتا۔

نوجوان کی موجودگی سے گھبرانا اب پرانی بات ہو چکی تھی۔وہ اس سے بات کرنے کی دانستہ کچھ ایسی کوشش نہ کرتا تھا مگر کبھی کبھار بات ہو جایا کرتی تھی۔وہ اسے اسی انداز سے چپ چاپ دیکھا کرتا۔

بچہ اب اس سے کچھ کھل گیا تھا بلکہ مانوس بھی ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی ننھی ننھی باتیں اس سے کیا کرتا تھا۔

پھر ایک صبح نوجوان بس سٹاپ پر اکیلا آیا۔اسنے بچے کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ بیمار ہے۔

اگلے دو دن نوجوان ہی آیا اور نہ بچہ۔لڑکی بے چین سی منتظر رہی۔اس کے بعد کے دو دن ہفتہ اور اتوار کے تھے۔لڑکی پر اداسی کا حملہ سا ہو گیا تھا۔وہ ٹھیک سے سو پائی نہ ڈھنگ سے کچھ کھا پائی۔ان لوگوں کے بارے میں کچھ جانتی بھی نہیں تھی۔

معاً اسے خیال آیا کہ اگر وہ لوگ کبھی نہ آئے تو؟

تو کیسے تلاش کرے گی ان کو؟

''اس بچے کو؟

اور اس ۔۔۔۔اس نوجوان کو۔۔خاموش ،سنجیدہ سے، ثابت قدم سے اس نوجوان کو۔۔۔

اور۔۔اگر اس بچے کی بھی۔۔۔۔اگر کوئی پھوپھی ہوئی تو؟۔۔تو سب پھوپی کی ہی بات مانیں گے۔۔اور۔۔اور۔۔''

اس نے بالکل بچوں کی طرح سوچا تھا۔

بچے کا بھولا سا چہرہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

پیر کے روز نوجوان پھر اکیلا آیا تھا۔لڑکی کی بیقرار سی نگاہیں اس کے اطراف گھوم گئیں۔

'' اس کی طبیعت ....کیا اب بھی خراب.........'' لڑکی نے نوجوان کے چہرے پر بے چینی سے تھرکتی ہوئی پتلیاں دوڑائیں۔

'' ہاں ...راہل اپنی ماں کو بہت یاد کرتا ہے...''نوجوان پریشان سا بولا۔

'' اور گھر میں کیا... کوئی نہیں جس سے وہ مانوس ہو........''

''سب ہیں ..دادا دادی چچا پھوپھی...مگر اس کی اداسی کسی صورت....''نوجوان کے چہرے پر کرب اتر آیا تھا۔

''اور اس کے فادر ۔۔۔؟''لڑکی کچھ حیرت زدہ سی فوراً بولی۔

میں..... میرا بیٹا ہے وہ ۔۔'' نوجوان پہلے جیسے ہی لہجے میں رک کر بولا۔
لڑکی کے چہرے کی حیرت اس کا جواب سننے سے پہلے ہی غائب ہوگئی تھی غالباً اس کے چہرے کا کرب دیکھ کر اسے اچانک اس جواب کی توقع ہوگئی تھی۔۔ اس نے سر جھکا لیا۔اور سنجیدہ سی اپنے پیروں کی جانب دیکھتی رہی۔

''تم....شادی کرلو ا..گ..ر.....مجھ سے تو.... اسکو...اسکو...... ماں....مل جائے گی۔۔اور میں...تم...میں...میں.. ''چندرکانت نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اسی لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔لڑکی نے اپنا سنجیدہ چہرہ اوپر کیا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

چندرکانت ناگپال کے گھر کا کوئی فرد اس رشتے پر رضامند نہ تھا۔اور روہنی ساہنی کی دادی ماں اور والد اپنی نوعمر اور غیر شادی شدہ بیٹی کی زبان سے ایک بچّے کے باپ سے شادی کرنے کے ذکر پر مارے غصّے کے کھول رہے تھے۔
لیکن روہنی جیسے کہ فیصلہ کرچکی تھی۔گھر والوں کی ہر بات خاموشی سے مان جانے والی روہنی کو اس کے اس ارادے سے کوئی باز نہ رکھ سکا۔

'' اتنے غور سے .... اتنی دیر تک کیا دیکھا جا رہا ہے... میز کے اندر ....'' شوکمار شرواستو مسکرایا تو روہنی ناگپال نے ایک لمبی سی آہ بھر کر دراز بند کردی اور ہلکے سے مسکرائی۔

'' سوری۔۔ کچھ خاص نہیں۔آپ اپنا آئیڈیا سنایئے۔''اس نے مسکراہٹ چہرے پر قائم رہنے دی۔اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر ہتھیلیوں میں ٹھوڑی تھام لی۔

جگنو پچھلی تقریب کی تصاویر ہاتھ میں لئے ہنستی مسکراتی کاؤنٹر پر آ گئی۔انگریزی سے لکھے 'مرمیڈ کے دونوں ' ایم ' اور ' آئی

' کا نقطہ جو بجلی کے بلبوں سے تاج کی صورت روشن' لوگو ' میں دمکتے رہتے،تقریباً تمام تصویروں میں جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

کچھ دیر کے لئے روہنی کو یقین نہیں آیا کہ یہ تصویریں اسی کی منعقد کردہ تقریب کی ہیں۔یہ بڑے بڑے' ڈزائنرس ' اسی کے تشہیری جلسے میں شریک ہونے آئے ہیں۔کیا واقعی تقدیر اس پر مسکرا اٹھی ہے۔کیا واقعی وہ بیکاری کے خیال،بے روزگاری کے خدشے،اور بے شناخت ہونے کے انجانے خطرے سے نکل آئی ہے۔۔(شناخت کا خیال اسے اُسی لمحے آیا تھا۔)۔کیا سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔۔ٹھیک ہو رہا ہے۔۔اس کا۔۔اسکے گھر کا مستقبل محفوظ ہو گیا ہے۔۔ہو۔۔رہا ہے۔۔پھر یہ کیا ہے جو اچانک ابھی ابھی ذہن

میں کھنچ آئی ست رنگی قوس و قزح کے بیچ دھوئیں کی لکیر سا لہرا گیا تھا۔۔

ولگر لگ رہی ہو۔۔اس لباس میں۔۔۔۔۔

کتنی کوشش کی تھی اس نے کہ چندرکانت ہر عام انسان کی طرح۔۔ایک اچھے باپ کی طرح۔۔ایک اچھے شوہر کی طرح۔۔۔ اپنے کام میں بذاتِ خود دلچسپی لے۔۔ورنہ ۔۔۔ان دل دکھانے والی باتوں کی۔۔۔نوبت کیوں آتی۔۔

ولگر۔۔۔ولگر۔۔۔یعنی۔۔بے حیا۔۔یا برہنہ۔۔یا بے شرم۔۔یا آوارہ یا۔۔۔یا عیّاش۔۔۔۔یا۔۔یا۔۔۔۔؟

یا۔۔۔کچھ نہیں ۔۔وہ ایسی کچھ نہیں ہے۔۔وہ ایک انسان ہے۔۔ایک ماں ہے ۔۔جو کسی نہ کسی طرح اپنی گھر جنّت میں خوش تھی۔۔اسے فیشن ڈزائننگ میں ڈپلوما ہی یاد تھا نہ اپنا محبوب مضمون تاریخ۔۔وہ دو معصوم اذہان کی ماں ہے۔۔دو خوابوں بھری زندگیوں کی۔۔۔دو مستقبلوں کی۔۔۔۔ جن کو عمر کے اس حساس موڑ پر وہ اندیشوں میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی تھی۔معمولی آسائشوں کے لئے ان کا حالات کے ساتھ مجبور سمجھوتا کرنا اسے ریزہ ریزہ کئے دیتا تھا۔

وہ تصویروں کو بغور دیکھتی رہی۔ چھوٹے ترشے بالوں اور کچھ دبلے ہو گئے بدن میں وہ اچھی لگ رہی تھی۔

شوکمار شریواستو کا نیا آیڈیا گو بالکل ہی نیا نہ تھا مگر روہنی کی جیولری ڈِزائن میں مہارت کے سبب اس میں نئے امکانات ضرور تھے۔

''کچھ زیادہ بوجھ نہیں ہو جائے گا........''

شہر کے 'میریڈئین 'میں ڈنر کے دوران اس نے 'پرپوزل' سن کر سوال کیا تو شوکمار شریواستو کی بجائے جگنو نے ہاتھ میں تھاما کانٹا جس میں اس نے ابلی مٹر کا ایک دانہ ابھی ابھی پرویا تھا ، پلیٹ میں رکھ دیا۔

'' نہیں روہنی۔۔۔۔زرا سوچو شوشری ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔یہ کچھ اتنے بوجھ والا کام نہیں ۔۔۔بلکہ تمہارے ڈپلوما میں چار چاند لگانے والا ہے۔۔۔وہ ایسے کہ۔۔۔'' شوکمار شری واستو نے ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

'' وہ ایسے کہ.....'' اس نے پلٹ کر بار کی طرف نظر دوڑائی تو بار کی ہلکی روشنی میں ویٹر کلف لگے سفید بڑاق جگمگ جگمگ کرتے کپڑے میں لپٹی آدھی بھری بوتل ٹرے میں لئے لپکا اور شوکمار شریواستو کے جام میں چند قطرے انڈیل کر خواتین کی طرف دیکھنے لگا۔

'' سم مو وائن میم ؟'' وہ آدھی کمر اور پورے شانے جھکا کر بولا۔

''او۔نو۔۔'' روشنی نے جلدی سے کہا۔

''او۔ یس۔'' جگنو نے ہنس کر کہا تو روشنی اور شوکمار شریواستو بھی ہنسے۔ ویٹر نے ہونٹ بھینچ کر مسکرانے کے انداز میں پھیلائے اور نہایت ادب سے سر کو بیک جنبش خم دے کر جھکایا اور فوراً سیدھا کیا۔

'' شیور میم۔'' اس نے ان دونوں کے خالی جام جو ہلکے ہرے گل بوٹوں والے کانچ سے بنے تھے، اپنے دستانے والے ہاتھوں سے اٹھا کر سفید رومال سے ڈھکی کشتی پر بے آواز رکھے۔ پھر سر کو ہلکی سی جنبش دیکر پھرتی سے ایک قدم پیچھے ہٹا اور واپس مڑا۔

''ویٹر۔۔'' شوکمار شری واستو نے جلدی سے مگر دھیمی آواز میں پکارا۔

'' ہماری بلو لیبل کہاں لئے جارہے ہو یار۔۔ ہم اپنی سیوا خود کرنے کے موڈ میں ہیں بھائی۔۔۔'' اس نے خوشدلی سے کہا۔

''ہاں تو ہم کہاں تھے۔۔ ینگ لیڈی......'' وہ روشنی کی طرف پلٹا۔

''ویٹر دو لے آنا۔۔۔۔میم ریلیکس ہو جائیں گی۔۔'' جگنو جلدی سے بولی۔

او۔یس۔'' شوکمار شری واستو نے مسکرا کر سر کو اثبات میں خم دیا۔

''یس میم'' ویٹر نے پھرتی سے پلٹ کر سر جھکا کر کہا۔

'' جگنو بس کرو۔۔ میں کہاں ڈرنک کرتی ہوں ۔۔''

'' یہ کون سی ایسی ڈرنک ہے بھائی۔ کم آن۔۔تم ریلیکس ہو جاؤ گی۔۔۔ٹینس ہو۔۔'' جگنو نے سر ہلا ہلا کر کہا۔

''ہئے۔۔اِٹ وِل ہیلپ یوٹیک دی رائٹ ڈیسیژن۔۔۔'' شوکمار شریواستو نے بھی سر ہلایا۔اس وقت تک ویٹر سرخ وائین کی چھوٹی سی سبک بوتل لے کر آچکا تھا۔

''ہوش اڑانے والی چیز فیصلہ کرنے میں کیا مدد دیگی۔'' روہنی نے آہستہ سے کہا۔

''اتنے دنوں بعد ہم خوش نصیبوں کو زرا سا جشن منانے کا موقع ملا ہے اور آپ ہیں کہ۔۔'' گُڈ وائن۔۔۔اِٹس ویپنگ۔۔'' جگنو نے جام کو بغور دیکھا پھر اسکے اندر کنارے سے تہہ کی جانب دھیرے سے لڑھکتے ہوئے عنابی رنگ قطرے پر انگلی سے باہر کی طرف گویا لکیر کھینچی۔

''اچھا۔؟ وائن ایکسپرٹ۔۔....'' روہنی ہلکے سے مسکرائی۔

'' یس۔۔۔ دیٹ آئی ایم۔۔اچھی نہ ہوتی تو قطرے کانچ پر ٹک ہی نہ پاتے۔۔۔'' وہ گلاس کو دیکھتی رہی۔

''تو اب کچھ کام کی بات ہو جائے۔۔اگر اجازت ہو تو۔۔۔۔۔۔۔'' شوکمار شریواستو نے دونوں کو باری باری دیکھا ۔

''آف کورس۔۔۔'' دو میں سے کسی نے کہا۔

'' وہ ایسے کہ جیولری کے ڈیزائنرز جو عام طور سے کانوں، گلے اور کلائیوں کی سجاوٹ کے لئے بنائے جاتے ہیں انہیں زرا آگے لیجا کر بازو بند ، کمر بند تک بڑھانا ہے۔ بالکل نازک سا کمر بند کہ صرف جلد پر بھی پہنا جائے تو ناف کے گرد دائرے کی شکل میں نگوں اور موتیوں سے سجا ہو۔۔''

''اس میں ایسی کیا اٹریکشن ہوگی شوشری۔۔'' جگنو نے گردن کو زرا سا خم دیا۔

'' کچھ خاص نہیں۔۔۔لیکن، جب سارے رنگوں میں میٹلِک ٹچ ہو۔۔یعنی دھات ایسے نظر آنے والے رنگ ہوں جیسے پیتل ،تانبے ،چاندی اور سونے جیسے مگر سب ڈل شیڈس میں یعنی سیاہی مائل سے نظر آنے والے۔۔اور ان کے ساتھ انہی شیڈس اور ڈیزائن سے

ملتے جلتے جوتے ہوں۔۔اور فئر، براؤن اور ڈارک براؤن کمپلیکشن کی لڑکیاں انہیں ماڈل کریں تو۔۔کون ایسی چیزوں کو نہ خریدنا ایفورڈ کر سکے گا؟''

وہ ان کے چہروں پر ردِعمل تلاش کرنے لگا۔

''یہ بات تو بالکل نئی ہوگی بوس۔۔مگر لیدر پر ویسی امبرائڈری بڑا مشکل معاملہ ہے سر۔۔کسی نے کچھ بدلنے کا آڈر دے دیا تو بہت دن لگ سکتے ہیں۔۔یا تو ہاتھ سے کڈھائی والا خیال چھوڑ دیا جائے۔'' جگنو نے سر جھلا کر کہا۔

''اتنے کمپیٹشن میں۔۔'' جگنو نے روہنی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے وائن کے گلاس کو انگلیوں سے دھیرے دھیرے گھما رہی تھی۔

''ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی میم۔۔ موٹے کپڑے کے استر والے جوتے بنوائے جائیں گے یا ریگزین کے۔اور ہماری ڈیزائنر صاحبہ، یعنی ۔۔ مز روہنی۔۔ جوتوں اور ہینڈ بیگز پر بلکہ کبھی کبھی ہیٹ پر بھی، ویسا ہی ڈزائن بنوائیں گی مگر گراف والا۔یعنی جیومیٹریکل۔۔اور پتھروں اور نگوں کا رنگ وہی ہوگا۔۔مگر وہ قیمتی پتھر نہ ہو کر رنگے ہوئے زرقان ہوں گے اور لباس کے مقابلے میں کچھ بڑے بھی ۔۔ امیریکن ڈائمنڈز....اور قیمت بھی نسبتاً کم ہوگی۔کسٹمر لینے سے پہلے سوچ میں نہیں پڑے گا۔''

اسنے دونوں کو باری باری دیکھا۔اور ابرو اوپر نیچے کرتا ہوا سر ہلانے لگا۔

''کچھ بنی بات .... یا میری انرجی یوں ہی ویسٹ ہو رہی ہے۔؟''

او..یس۔۔'' جگنو نے روہنی کی طرف دیکھا۔

'' بالکل بنی......'' روہنی کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی۔

''اینڈ بیلیو می ......نہ وقت ضائع ہوگا، نہ انویسٹمینٹ ....'' وہ مسکرایا

سو.....ڈن....؟'' اسنے جام والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔

'' یس........'' جگنو نے بھی جام اٹھایا۔

''شیور.......'' رونی بولی۔

جام سے جام ٹکرائے۔ایک دوسرے کو مبارک باد دی گئی۔

گھروں کو لوٹتے ایک بجنے لگا تھا۔

صبح رونی کو شوروم چھوڑنے کے بعد گاڑی راہل لے گیا تھا۔

جس وقت شوکمار شریواستو رونی کو گھر چھوڑنے گیا، برآمدے میں کھڑا چندر کانت ناگپال سگرٹ پھونک رہا تھا۔

شوکمار شریواستو گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے پھرتی سے نیچے اترا اور بائیں ہاتھ سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولے کھڑا رہا۔

''یس میم۔۔'' اس نے داہنا ہاتھ ٹائی کی گرہ سے ذرا سا نیچے سینے پر رکھ کر سر جھکایا اور مسکرا دیا۔

''یس سر۔'' وہ بھی مسکرائی۔

'' تھینکس اے لاٹ۔۔۔گڈ نائٹ۔'' وہ بولی۔

''گڈ نائٹ میم۔۔'' وہ کھڑا رہا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔رونی نے غالباً سیکنڈ بھر کے توقف کے بعد اپنا چھوٹا سا ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور گھر کی طرف لپکی۔اس نے جلدی سے زینہ طے کیا اور دروازے کا لاک کھولنے کے لئے پرس میں سے چابی نکالی ہی تھی کہ چندر کانت نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔

'' یہ کون تھا۔؟'' رونی پر نظر پڑتے ہی اس نے پوچھا۔

''اوہ۔وہ ہمارا بزنس پارٹنر تھا نا۔۔۔۔۔شوکمار شریواستو۔۔'' وہ اندر آتے ہوئے بولی۔

'' مگر یہ تو کوئی لڑکا تھا۔۔'' وہ ماتھے پر بل ڈالے دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔

'' مجھ سے کوئی دو سال بڑا ہوگا۔۔لڑکا کہاں ہے۔۔۔آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں ۔۔۔۔۔''

''اتنی دیر کہاں لگائی۔۔۔۔۔؟''

'' ہم لوگ ڈنر پر گئے تھے۔۔''

''تم لوگ۔۔؟ تم اور یہ آدمی۔۔۔۔۔''

''ہاں اور جگنو بھی تھی۔۔'' رونی نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

'' اٹ واز اے بزنس ڈنر۔۔۔''

''مجھے تمہارے بزنس ڈنرس میں کوئی دلچسپی نہیں ۔سمجھیں؟'' اس نے اچانک آواز کچھ اونچی کر دی۔

'' مگر یاد رکھو اگر تم نے یہ طریقہ اپنایا تو میں یہ برداشت نہیں کرونگا۔۔۔۔''

''مطلب۔؟'' رونی ہاتھ میں پکڑے ہینگر پر کوٹ رکھتے رکھتے رک گئی اور ماتھے پر شکن ڈالے بولی۔

''تمہارا رات کو آنا مجھے بالکل پسند نہیں۔۔۔'' وہ دوسری جانب منہ کر کے زرا آہستہ بولا۔

'' کام نہیں کروں کیا۔۔۔ شوروم پر ہی دس بج جاتے ہیں۔۔دن بھر کا حساب کرتے ...سب کچھ سمیٹتے۔۔ڈمیز کا ڈریس بدلتے۔۔۔''

''تمہارا مطلب ہے میں نکما ہوں۔۔۔'' وہ بھنویں سکیڑے نتھنے پھلائے اسکے چہرے پر جیسے کہ حقارت سے نظریں جمائے رہا ۔

'' میں نے کب کہا۔مگر گھر تو چلنا چاہئے نا۔۔کام وام تو ہونا ہی چاہئے۔۔۔۔'' رونی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ اس عجیب سے سوال کے جواب میں کیا کہے۔

''آج نہیں تو کل آپ کوئی نہ کوئی کام تو کرنے ہی والے ہیں۔پھر نکما ہونے والی بات کیسے سوچ لی آپ نے۔۔یہ تو ایک موڑ آ گیا ہے زندگی میں، ختم ہو جائے گا۔۔آپ کچھ کرنا شروع ہی کر دیں۔۔میں چھوڑ دونگی۔۔ایسا کیا ہے۔۔'' وہ نرمی سے بولی تو اس کے چہرے پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ جیسی کوئی شے چھا گئی۔

اگر چندر کانت سچ مچ ہی ہر عام انسان کی طرح گھر سے باہر جا کر باقاعدگی سے کام کرنا شروع کر دے تو اسے گھر میں بہت سا خالی وقت مل جائے گا۔۔ اپنے دیرینہ شوق کی تکمیل کے لئے۔۔ وہ تاریخ کی بہت سی کتابیں خرید لائے گی۔۔ اور، بہت سی تحقیق کرے گی۔۔ اور۔۔ اور ایک۔۔ ایک ایسی کتاب تخلیق کرے گی جیسی۔۔ جیسی کسی نے بھی۔۔

چندر کانت کی دفعتاً اونچی ہوتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے گزر کر ذہن میں سجے کورے اوراق پر سیاہ روشنائی کی صورت پھیل گئی۔

"تم مجھے مت سکھاؤ کہ کیا کرنا ہے مجھے۔۔ میں جانتا ہوں۔۔۔ تم بس اپنی حدوں کو پار کرنے کی کوشش مت کرنا۔۔ سمجھ گئیں۔۔"

اس نے دانت پیس کر کہا۔

رونی لباس تبدیل کرنے لگی تھی۔ وہ کپڑے ہاتھ میں تھامے الماری کی آڑ کے نسبتاً اوجھل حصے میں ہو گئی۔ چندر کانت کے سامنے کپڑے بدلنے کو اس کا جی نہ چاہا۔

اب کئی دنوں سے رونی ناگپال اور چندر کانت ناگپال کے گھر میں اسی طرح کی گفتگو ہوا کرتی۔

گھر سے باہر بھی رونی کے تصور میں جیسے کہ بے خیالی میں ہی چندر کانت کا چہرہ، غصے، حقارت اور بیزاری بھرے تاثرات لئے اس کے سامنے آ جاتا۔ وہ اِدھر اُدھر کی بات پر دھیان دینے کی کوشش کرتی تو بچوں کے پھول سے چہرے اس کی نظروں میں گھوم جاتے۔ اس

کی آنکھوں میں اداسی تیر سی جاتی۔ اگلے پل پھر ایک چہرہ اسکے حواس پر رنج اور ڈر کے حملے سے کرنے لگتا تو اس بے رحم برتاؤ کے تصور پر معصومیت غالب آ جاتی۔ پھر اُسے گھر جانے کے خیال سے خوف سا آنے لگتا۔ وہ طے نہ کر پاتی کہ ابھی گھر جائے یا کچھ دیر اور کسی کام

میں لگی رہے۔

گھر سے سکون ہی رخصت ہو گیا۔۔

کب تک چلے گا ایسے آخر۔۔

شوکمار شریواستو کی گاڑی میں بیٹھی روہنی کے ہونٹوں سے دبی دبی سی آہ نکل گئی۔

'' کیا سوچا جا رہا ہے۔۔ کبھی کبھار تو موقعہ ملتا ہے آپ کو لفٹ دینے کا، اور آپ ہیں کہ ہم کو لفٹ ہی نہیں دیتیں۔'' شوکمار شریواستو بولا تو وہ ہنس دی۔ اسی لمحے اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔

'' کہاں ہو تم۔۔؟ دو گھنٹے سے نیچے سڑک پر تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔۔'' چندر کانت کی گرجتی ہوئی آواز گونجی۔

''بس پہنچ رہی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی اور فون بند کر دیا۔

چندر کانت اتنی زور سے بولا تھا کہ اس کی آواز روہنی کے دوسرے کان سے ہوتی ہوئی شوکمار شریواستو کی سماعت تک بہ آسانی پہنچ گئی تھی۔

''کیوں کھڑے ہیں دو گھنٹے سے ناگپال صاحب نیچے بھلا۔۔۔ آپکی محبت میں۔۔۔؟ مگر اس آواز میں تو محبت نہیں دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ میرا مطلب سنائی نہیں دے رہی تھی۔۔۔ مجھے۔۔''

روہنی نے کچھ نہ کہا۔ گھنٹی پھر بجی۔

''ہو کہاں تم؟ اس سالے شوکمار کے۔۔''

روہنی نے صرف ہیلو ہیلو کہا اور فون بند کر دیا۔ لیکن شوکمار شریواستو نے اپنا نام اور خطاب دونوں سن لئے تھے۔

'' یہ آدمی گھر بیٹھ کر صرف گالیاں دے سکتا ہے نا۔'' شوکمار شریواستو اپنے غصے کو مکمل قابو میں رکھے سامنے کی جانب دیکھتا ڈرائیو کرتا رہا۔

''آئی ایم سوری۔۔۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''آئی ایم ری اے لی ویری سوری۔۔۔'' روہنی کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ اگر وقت دن کا ہوتا تو شوکمار شریواستو اس کے اچانک سرخ ہوئے چہرے پر گھبراہٹ، بے بسی اور ندامت کے تاثرات یکجا دیکھ سکتا تھا۔

گھر کی گلی کو مڑنے والے موڑ پر ہی روہنی نے گاڑی رکوادی۔

''پاس ہی ہے۔۔ چلی جاؤں گی۔۔'' وہ گاڑی کے رکتے ہی فوراً دروازہ کھول کر باہر آئی اور دروازہ عجلت سے بند کر کے گلی کی جانب مڑی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ شائد ایر کنڈیشنڈ گاڑی کی حرارت سے باہر یکلخت دسمبر کی سردی میں نکل آنے کے سبب۔ مگر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چہرے پر آرہے بالوں کو تھرتھراتی انگلیوں سے پیچھے کی جانب ہٹاتی تیز تیز چلنے کی کوشش میں گھبرائی ہوئی سی گھر پہنچی۔ دروازے کا قفل کھول کر خوابگاہ میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ چندر کانت کے ہاتھوں میں نیند کی گولیوں کی شیشی اور پانی کا گلاس تھے۔ اس سے پیشتر کہ روہنی کچھ سمجھ پاتی اس نے شیشی منہ میں انڈیل کر پانی پینا شروع کر دیا تھا کچھ گولیاں زمین پر بھی گر گئیں۔ روہنی نے پاس پہنچتے ہی گلاس گرانے کی کوشش کی مگر وہ جب تک باقی گولیاں نگل چکا تھا۔

''میں یہ زندگی نہیں جی سکتا۔۔ سمجھیں؟'' وہ چیخا۔

''تھوک دیجئے بھگوان کے لئے۔۔ یہ کیا۔ یہ۔۔ یہ راہل۔۔۔'' اس نے چندر کانت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی اور چیختی ہوئی بچوں کے کمرے کی طرف بھاگی۔

بروقت ہسپتال پہنچا کر اگر اسکا معدہ دھویا نہ گیا ہوتا تو وہ شاید بچ نہ پاتا۔

''ڈیڈ۔۔ وائی۔۔ ؟ کیوں کیا آپ نے ایسا۔۔؟'' راہل نے مسہری پر پڑے باپ کے اترے چہرے کو بے چارگی سے دیکھ کر کہا۔

'' اپنی ماں سے پوچھو۔۔'' اس نے دوسری طرف کھڑی روہنی کو حقارت سے دیکھا۔ روہنی نے راہل کی جانب نظر ڈالی۔ وہ سر جھکائے اپنے جوتوں کو دیکھتا رہا۔

انیس بیس برس کا وسیع شانوں والا بلند قامت لڑکا، ہسپتال کی چھوٹی سی تپائی پر اپنے جسم کو سمیٹے رکھنے کی کوشش کرتا ہوا گویا بے بس سا بیٹھا تھا۔

روہنی کے دل میں جیسے کہ درد کی لہر سی اٹھی۔

'' کیوں آپ بچوں کو ڈسٹرب کرنے والی باتیں کرتے ہیں۔۔ آرام کیجئے۔۔ پلیز۔۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

'' پاپا ٹھیک ہیں بیٹا۔۔ جاؤ۔۔ منی کو سکول سے لے آؤ پھر یہاں سے ہوتے ہوئے جانا ۔۔ سب ساتھ گھر جائیں گے۔'' راہل اوپر دیکھے بغیر اٹھا اور باہر نکل گیا۔

'' آپ پلیز سمجھنے کی کوشش کیجئے۔۔ ایسا کچھ بھی نہیں جو آپ اتنے پریشان ہوتے ہیں ۔۔ اس کی گریجویشن ہو جانے دیجئے۔۔ سب خود ہی سنبھال لے گا۔۔ دو سال کی ہی تو بات ہے۔۔ بچے اس طرح ' ان سیکیور ' ہو جائیں گے۔۔'' وہ پلنگ کے قریب تپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کی ایک آنکھ سے آنسو ٹپکا تو دوسرا اس نے جلدی سے پونچھ لیا۔ چندر کانت اسکی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔

منی آٹو رکشا میں بیٹھ کر ہسپتال آ گئی تھی۔ دونوں بہن بھائی دروازے کے پاس چپ چاپ کھڑے اندر دیکھ رہے تھے۔ حیران و پریشان سے۔ روہنی کی نظر اس طرف اٹھی تو آنکھوں میں اور آنسو بھر آئے۔ مگر اس نے چہرے پر کوئی تاثر نہ آنے دیا۔

اس کے بعد بہت دنوں تک یہ منظر رہ رہ کر بغیر چاہے روہنی کی آنکھوں کے سامنے آتا رہا تھا۔

ایسے میں اس کا جی چاہتا کہ دی مرمیڈ شوروم کے کاؤنٹر کے عقب میں آرام دہ کرسی کی گویا

محفوظ سی پناہوں میں چھپی رہے۔کہیں نہ جائے۔اس طرح کے احساس محرومی میں گھری بے دست و پا سی وہ کبھی کبھی شوکمار شریواستو کی آمد سے اپنے اندر عجیب سی راحت محسوس کرتی۔جیسے،ڈر،گھٹن،بحث یا ذلت،جیسی کسی شے کا دنیا میں وجود ہی نہ ہو۔

عجب سا احساسِ تحفظ۔۔

اس نے سوچا۔

اور۔۔اگر تحفظ نہیں بھی ہوتا تو بھی کیا فرق پڑتا۔۔۔چاہئے بھی نہیں اسے کسی کا تحفظ۔۔۔کچھ غلط تو کر نہیں رہی وہ۔۔کچھ غلط نہیں کیا اس نے۔۔پھر۔۔یہ خوف۔۔یہ ڈراونا سا احساسِ تنہائی۔۔روح کے کہیں اندر یہ دائمی سائغم۔۔کیوں۔۔۔کیوں۔۔آخر کیوں؟

گھر کی خاطر ہی تو وہ۔۔۔ورنہ۔۔بچے۔۔۔ بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔۔۔چندر کانت کی سمجھ میں یہ باتیں کیوں نہیں آتیں۔۔

وہ ماتھا کاؤنٹر پر ٹکا دیتی۔

ہسپتال سے آکر چندر کانت نے مے نوشی بڑھا دی۔وہ زیادہ وقت تک اور زیادہ مقدار میں پینے لگا تھا۔شام ہوتے ہی وہ جام تھام لیتا ااور بار بار رونی کو فون کرتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے ،کس کے ساتھ ہے اور کب آئے گی۔ بلکہ اس نے رونی سے کہا کہ وہ فون بند ہی نہ کرے۔ تاکہ اسے خبر رہے کہ وہ کب کب کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔

اس بات پر بھی بحث ہوئی اور چندر کانت اونچی آواز میں ناراضگی کا اظہار کرتا اوپر چھت کی جانب گیا۔شور سن کر گھر کا ملازم اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تو چندر کانت ریلنگ کی طرف دوڑ کر ایک پاؤں ریلنگ پر چڑھانے لگا۔ملازم کی یہ دیکھ کر چیخ نکل گئی اور بھاگ کر اسے پکڑ لیا۔

''صاحب جی۔۔ صاحب جی۔۔''وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''ارے چھوڑ ایڈیٹ۔۔''اسنے ٹانگ واپس اتار لی تھی اب وہ اونچی آواز میں ملازم کو

ڈانٹ رہا تھا۔ بچے بھاگے بھاگے اوپر آ گئے تھے۔ نچلی منزل کے مکین مسٹر اور مسز ملہوترا چھت پر پہنچ کر چندر کانت کو نیچے لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

'' گھر کی بات گھر میں ہی رہنی چاہئے۔۔۔ایسے اچھا لگتا ہے کیا۔آپ تو سمجھ دار انسان ہیں۔''ملہوترا صاحب نے چندر کانت کا شانہ تھپتھپایا۔

''ارے ہوتا ہے بھائی صاحب۔۔ ہر گھر میں جھگڑا ہوتا ہے۔کہیں زیادہ کہیں کم۔۔اچھا نہیں ہوا آپ کے ساتھ۔۔۔بہت برا ہوا۔مگر اب اپنی جان کیوں آپ اس طرح۔۔۔''

مسز ملہوترا زور زور سے بول رہی تھیں۔آواز سن کر برابر والے گھر میں رہائش پزیر کسم اور اسکا شوہر للت بھی آ گئے تھے۔ایک تماشا سا شروع ہو گیا تھا۔

روہنی جلدی سے نیچے چلی آئی اور پوجا والے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بھیڑ دیا۔بہت سی باہوں والی نقرئی مورتی کو وہ کچھ پل ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہی پھر اس نے اپنا سر مورتی کے ننھے ننھے پیروں پر رکھ دیا اور بلک بلک کر رو پڑی۔

چندر کانت کو مسٹر ملہوترا سہارا دے کر گھر تک لے آئے۔راہل برآمدے میں کھڑا تھا۔اندر داخل ہوتے ہوئے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔اس اتوار کی شام کے لئے اس نے غالباً کچھ اور سوچ رکھا تھا۔

''ڈیڈ۔۔۔اگر آپ ایسے ہی کرتے رہے تو ہمیں آپ کو مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرنا پڑے گا۔۔۔۔'' اگلی صبح راہل بیدار ہوتے ہی باپ کے کمرے میں داخل ہوا۔

'' اس طرح آپ سارے گھر کو بدنام کر رہے ہیں ڈیڈ۔۔۔ماما ہم سب کے لئے کام کر رہی ہے۔۔آپ ان کے پیچھے ہی پڑ گئے۔۔گھر میں خرچہ تک نہیں ہوتا تھا یاد ہے آپ کو۔۔۔یہ سب مام کی وجہ سے ہے جو آپ شام ڈھلے ہی ووڈکا کی بوتل لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔کون کرتا ہے یہ سب۔۔مائی مام۔۔او کے۔۔؟''

'' یو آر مام ؟ ہنہ۔۔۔وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے۔۔۔سوتیلی ماں ہے وہ تمہاری۔۔۔۔
سمجھے؟'' چندر کانت نے نتھنے پھلا کر ماتھے پر شکن ڈالی۔
'' نو۔نو۔۔آپ ہیں سوتیلے باپ۔۔وہ میری سگی ماں ہے۔۔منی سے بھی زیادہ چاہتی ہے
مجھے۔۔آپ مجھے میری ہی ماں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں
ڈیڈ۔۔۔ڈیڈ۔۔آپ کو شرم نہیں آتی۔۔۔۔آپ۔۔۔۔۔آپ'' راہل غصے کو قابو میں رکھنے
کی کوشش کرنے لگا تو اس کے آنسو نکل آئے۔وہ کمرے سے باہر آیا تو منی سے ٹکراتے
ٹکراتے بچا۔وہ دروازے سے لگی چپکے چپکے سسک رہی تھی۔
''سکول نہیں گئیں تم۔۔''اس نے منی کا سر چھاتی سے لگا لیا۔
''جا رہی تھی بھیا۔۔نیچے سبزی والے کے پاس ملہوترا آنٹی کسم آنٹی سے کہہ رہی تھیں کہ اگر
وہ اور ملہوترا انکل کل ٹائم پر نہ پہنچے ہوتے تو ڈیڈ نے سوسائڈ کر لیا ہوتا۔میں گیٹ کے
اندر تھی۔کچھ دیر رک گئی کہ وہ جائیں تو۔۔مگر اتنے میں میں نے سکول بس کو اس طرف
سے واپس آتے دیکھا۔ان کے اندر جانے کے بعد دوڑتی بھی تو بھی نہ پہنچ پاتی۔۔۔
سنڈے کے دن بھی جب میں ماما کے ساتھ شوروم جا رہی تھی نا اس وقت بھی دونوں ہماری
باتیں کر رہی تھیں۔'' وہ دبی دبی ہچکیوں میں بولتی رہی۔
'' بکنے دے ان کو۔۔وہ کیا جانے ہماری پریشانیاں۔۔چل میں چھوڑ آتا ہوں۔۔ماما
دیکھیں گی تو اور پریشان ہوں گی۔چل آجا۔آ جلدی۔۔''

دی مرمیڈ کی اوپر والی منزل تک اندر کی طرف سے زینہ نکلوا کر بالائی حصے میں قیمتی اور
نیم قیمتی قسم کے پتھروں کے آرائشی سامان کا شوروم کھولنے کا ارادہ تھا۔رات کو شوکمار شریواستو
اپنی نگرانی میں کام کرواتا اور پھر صبح شوروم کھولا جاتا۔کبھی جلدی بند کرنا پڑتا،کبھی دیر سے کھولنا
پڑتا۔روہنی اور جگنو بھی بہت مصروف رہتی تھیں۔روہنی کے لوٹنے میں دیر ہوتی تو چندر کانت

گھر کے سامنے ٹہلتا رہتا۔ کبھی گھنٹہ، کبھی دو گھنٹے۔ یا اس سے بھی زیادہ۔ موبائیل فون سے مسلسل پیغام بھیجتا رہتا۔ وہ یہ کام گھر کے اندر سے بھی کر سکتا تھا مگر گھر میں جانے کیا چیز اسے چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی۔

اب نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ اگر اسے بیت الخلاء کے لئے اندر جانا ہوتا تو بلڈنگ کے گیٹ پر محافظ سے کہہ دیتا کہ میم صاحب کے آنے کا ایک ایک منٹ نوٹ کر لے۔

اور میم صاحب آتیں تو نہائت بیچارگی سے گارڈ سے کہتیں کہہ دینا اسی وقت آگئی تھیں اور مسز ملہوترا سے بات کر رہی تھیں۔

اب یہ باتیں دربان سے ڈرائیوروں تک ہوتی ہوئیں پاس پڑوس کے گھروں میں پھیل چکی تھیں۔

نوعمر بہن بھائی سر جھکائے نظریں چرائے آتے جاتے دکھائی دیتے۔ روہنی بھی نہائت سنجیدگی سے گاڑی میں بیٹھتی اترتی نظر آتی۔ اوپر سے چندر کانت برآمدے میں کھڑا دیکھا کرتا۔

بچے باپ سے کھچے کھچے رہنے لگے تھے۔ بلکہ زیادہ تر اپنے کمروں میں ہی رہتے تھے۔

اگلے دن جب روہنی کو آتے آتے اور دیر ہو گئی تھی۔ تو چندر کانت نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اس زور سے جھنجھوڑا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

'' گلا دبا دوں گا اگر پھر دیر سے آئی تو۔۔ نہیں چاہئے تیری یہ حرام کی کمائی۔۔ سمجھی۔۔۔؟'' وہ زور زور سے چیخا تھا۔ راہل نے آکر ماں کو اس سے چھڑا لیا تھا۔

اس دن سے روہنی کو اپنی خوابگاہ میں سونے کے خیال سے کچھ خوف سا آنے لگا تھا۔ وہ منی کے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ مگر سوتے میں اچانک اسے احساس ہوتا کہ چندر کانت بتی بجھائے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ کیونکہ قالین پر بغیر جوتوں کے ٹہلنے اور ایڑی کے فرش پر

پڑنے کی صدا روہنی کو فرش سے ہوتی ہوئی مسہری سے لگے اسکے کان تک پہنچتی صاف سنائی پڑتی تھی۔ایسے میں کسی انجانے خوف کی لہر سی اس کی ریڑھ کی ہڈی کے اندر سرائیت کر جاتی۔وہ سوئی ہوئی منی سے لپٹ کر چھوٹے بچے کی طرح کانپنے لگتی۔کبھی اچانک اٹھ کر اندر سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دیتی۔بلکہ اب وہ ہر روز اندر سے دروازہ بند کئے رکھتی تھی۔

پھر جانے کیا ہوا کہ چندر کانت کے روّیے میں اچانک تبدیلی نمودار ہوئی۔
وہ کچھ پرسکون سا نظر آنے لگا۔اس نے روہنی کو بار بار فون کرنا بند کر دیا۔دن بھر میں ایک آدھ بار پوچھتا کہ کب آرہی ہے۔اور کھانے پر منتظر ملتا۔کوئی غصہ نہ تقاضا۔روہنی کو تقدیر مہربان نظر آنے لگی۔گھر میں سکون محسوس ہوا تو جگنو کے سپرد کام کر کے وہ گھنٹہ بھر پہلے ہی گھر آجاتی۔بچوں نے باپ کو پرسکون دیکھا تو ان کے چہرے کھِلے کھِلے نظر آنے لگے۔
روہنی کو محسوس ہوا کہ قدرت کو اس کے بچوں پر ترس آگیا جو اس کے گھر کا سکون لوٹ آیا۔
جس دن چندر کانت نے بچوں اور دونوں ملازمین سے اپنے روئیے پر معافی مانگی،اس دن گھر کا سکون جیسے کہ یقینی ہو گیا۔

''میم صاب۔۔۔آج صاب کمرے کا لائٹ نہیں بجھائے ہیں۔۔۔۔جاگ رہے ہیں۔۔۔'' پرانی ملازمہ انو نے اس وقت روہنی سے کہا جب وہ کھانے کے قاب اٹھا کر ریفریجریٹر میں رکھنے میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔
''تو۔۔۔؟'' روہنی مسکرائی۔
''تو میم صاب آپ ادھر سونے کو نہیں جانا۔۔میرے کو اس روج سے۔۔۔'' انو نے گلا صاف کیا۔
''میرے کو وشواس نہیں رہا۔۔جب سے گلا پکڑے تھے آپکا۔۔۔آپ بے بی کے روم میں

ہی سونا۔۔۔''

''ارے چپ پاگل۔'' روہنی زور سے ہنسی۔

اسی وقت راہل ٹھنڈے پانی کی بوتل لینے اپنے کمرے سے باہر آیا تھا۔انو کی بات سن کر ٹھٹھک گیا۔

'' مام۔۔ شی از رائٹ۔۔آئی تھنک۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''کہیں پھر جھگڑا نہ کرلیں۔ اور ٹمپرلوز کرلیں۔۔اور۔۔'' وہ ماں کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

''ارے نہیں بیٹا۔۔وہ تو غصہ آگیا تھا انہیں اس دن۔۔ورنہ کیا سچ مچ تھوڑے ہی گلا دبا دیتے۔۔۔جاؤ سو جاؤ۔۔ریلیکس مائی چائلڈ۔۔''

روہنی نے اس کا رخسار تھپتھپایا۔

منی بھی اپنے کمرے میں سونے کی کوشش کر رہی تھی۔گو کہ اسے ماں کا اسکے پاس سونا زیادہ اچھا لگتا تھا۔مگر والدین کے درمیان تعلقات استوار ہونے سے وہ پرسکون تھی۔

انو اور راہل دونوں کا خیال غلط نکلا۔رات کسی جھگڑے کی آوز نہ آئی بلکہ صبح بھی سہانی نکلی۔ اور اس سے اگلی صبح بھی پر سکون گزر گئی تھی۔

گھر کی خوشیاں رفتہ • رفتہ لوٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔

اس دن روہنی شوروم جانے لگی تو بہت خوبصورت نظر آرہی تھی۔منی نے بڑے اعتماد سے ملہوترا آنٹی اور کسم آنٹی کو نظر انداز کر کے ڈورفون کی گھنٹی بجائی تھی۔اور سپیکر سے روہنی کی کھنکتی ہوئی صدا بلند ہوئی تھی۔

' آئی بیٹا۔۔بس ایک سیکنڈ۔۔تم بیٹھو گاڑی میں۔۔' اور وہ گہرے بھورے ٹراؤزرس اور آدھی آستینوں والے ہلکے بھورے ٹاپ کے ساتھ بھورے رنگے بالوں میں کم عمر اور نہایت جاذب معلوم ہو رہی تھی۔

اس دن چندر کانت ناگپال کچھ دیر بعد برآمدے میں آ گیا تھا۔ نکڑ والے مکان کی رس رہی ٹنکی سے نظر ہٹا کر وہ سڑک کی دوسری طرف ایستادہ درختوں کی چوٹیوں کو دیکھنے لگا۔ رومال سے چشمہ صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر جماتے ہوئے اسے آج دن میں ہی شراب کی شدید طلب ہونے لگی تھی اور وہ اندر آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد زینہ اتر کر بازار کی طرف نکل گیا تھا ۔آس پاس کبھی کسی نے چندر کانت ناگپال کو بغیر گاڑی کے گلی سے باہر پیدل جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اس دن وہ پیدل سڑک پر نکل گیا تھا۔

ااور دن ڈھلے تک گھر نہیں آیا تھا۔

راہل کالج سے شام کو جب گھر لوٹ رہا تھا تو ریلوے پھاٹک کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے باپ کو گھر کی جانب جاتے دیکھا کر گاڑی روک دی۔

’’ کم آن اِن ڈید۔۔ کہاں گئے تھے۔ ویٹ کر لیتے۔۔ میں تو آ ہی رہا تھا۔‘‘

’’نہیں بیٹا۔۔آج میں زرا ٹہلنا چاہتا تھا۔‘‘ وہ مسکرایا۔

’’تم چلو میں آتا ہوں۔۔ لیزی ہو گیا ہوں۔۔ زرا سیر ہو جائے گی۔۔‘‘ وہ ہنسا۔

’’آر ی یو شوئر ڈیڈ ۔۔‘‘

’’ یس وری شیوئر۔۔‘‘

’’بائے۔۔‘‘

راہل نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

اگلے دن اتوار تھا۔ گھر کے چاروں افراد دیر تک کھانے کی میز پر بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر بچے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔ والدین کے کمرے سے دیر تک قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں تو بچے بعد مدت کے پرسکون ہو کر سو گئے۔

دوسری صبح چھٹی کی وجہ سے کسی نے الارم نہیں لگایا تھا۔

دروازے کی مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی سے راہل بیدار ہوا تھا۔دروازے پر پولیس کھڑی تھی۔

''یہ آپ کے فادر کا ڈرائیونگ لائسنس ہے؟'' انسپکٹر نے راہل کو رومال سے پکڑا کارڈ دکھایا۔

''ہاں۔ہاں۔'' وہ کچھ گھبرا کر بولا تھا۔

''وہ کہاں ہیں۔؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''سو رہے ہیں۔'' وہ گھبرایا سا فوراً بولا۔

''نہیں وہ وہاں نہیں ہیں۔ ان کا ایکسیڈینٹ ہوگیا ہے۔زرا آپ بیڈروم میں دیکھئے۔''

انسپکٹر کی بات سن کر راہل الٹے پاؤں والدین کی خوابگاہ کی طرف لپکا۔دروازہ اندر سے بند تھا۔اور جب کھٹکھٹانے پر نہ کھلا تو ڈرائنگ روم سے نکل کر وہ برآمدے کی طرف سے گیا۔اسے کمرا کھلا ملا۔

اس وقت تک سب کچھ بدل گیا تھا۔

اس کی ماں خون میں لت پت مسہری پر بے سدھ پڑی تھی۔

''ماما۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' اسکی دلدوز چیخ ابھری۔اس نے ماں کو ہاتھوں سے ہلایا۔

''ماما۔۔۔۔۔۔'' وہ چیخ چیخ کر ماں کو پکارنے لگا۔

''نو۔۔۔ماما۔۔نو۔۔ماما۔۔ماما۔۔۔ماما۔۔۔۔مار دیا میری ماما کو۔۔۔۔مار دیا پاگل نے۔۔''

اس کی چیخوں میں منی کی باریک باریک چیخیں شامل ہوگئیں۔

دونوں بہن بھائی جس وقت خون میں نہائی ماں کو اٹھا کر ہسپتال لیجانے کے لئے گاڑی میں

رکھنے کی کوشش کر رہے تھے تو پاس پڑوس کے لوگ دور تماشائی بنے کھڑے تھے، جن میں پولیس والے بھی شامل تھے۔

''وہ تو پہلے ہی مر چکی تھی۔۔''ایک پولیس والے نے دوسرے سے کہا تھا۔

ہسپتال میں روہنی کو مردہ حالت میں داخل کیا گیا قرار دیا تھا۔

چندرا کانت ناگپال نے بیوی کے سر پر رات کے تیسرے پہر ہتھوڑے سے وار کر کے اس کا گلا تیز دھار والے ہتھیار سے کاٹ دیا تھا۔ اور قتل کے آلات اور اپنے خون آلود کپڑے غسل خانے کے دروازے کے عین سامنے رکھ کر وہ گزشتہ شب حاصل کی ہوئی اطلاعت کے مطابق صحیح وقت پر ریل کی پٹری پر لیٹ کر خودکشی کر چکا تھا۔

اس کی قمیض کی اوپری جیب میں سے خودکشی کے اعتراف کا پرچہ برآمد ہوا جس میں اس نے شوکمار شری واستو کو اس حادثے کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔

گلی میں سارا دن پولیس اور میڈیا کی گاڑیاں بھری رہیں۔ گھر میں پولیس آتی جاتی رہی۔ جہاں صرف گھر کے ملازم انو اور نندن تھے۔ ٹیلیوژن چینلوں والے مکان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

ایک تازہ وارد ٹائی پہنے آدمی نے انو کو جالیا۔ اس کے عقب میں توپ خانے کی طرح دوسرا شخص کیمرہ سنبھالے چل رہا تھا۔

''آپ کو کچھ پتہ چلا تھا جب حادثہ ہوا ؟''

''نہیں جی۔۔ شام کو صاحب لوگ ٹھیک سے کھانا کھائے۔۔ ہنستے بولتے روم میں گئے تھے صاحب جی۔۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا۔۔''اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کیمرہ مین نے فوراً اس کی آنکھوں کو 'زوم اِن' کیا۔

''مالک کی غلطی تھی۔۔آپ کو کیا لگتا ہے۔۔؟''

''ہاں جی۔۔اب ایسا کیا تو گلت کیا۔۔اچھانہیں کیا۔۔۔'' وہ کہیں اور دیکھنے لگی تو سوال پوچھنے والا آہستہ آہستہ اس کی اور بڑھا، پیچھے پیچھے کیمرہ مین بھی۔ وہ ایک قدم پیچھے کی جانب ہٹی تو وہ دونوں بھی آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ منی کے کمرے کی دہلیز پر ٹھہر گئی۔ پیچھے پیچھے اخبار روالوں کی بھی ایک فوج تھی۔ دروازے کے اندر بائیں جانب میز پر کچھ تصویریں تھی۔ایک اخبار والے نے انو کے بالکل قریب سے ہی لمبا سا بازو اندر ڈال کر تصویر اٹھالی۔ تصویر میں مُنی سی منی والدین کی گود میں مسکرارہی تھی۔ انو حیرت سے صحافی کی طرف دیکھنے لگی۔

''بعد میں واپس کر دیں گے۔'' وہ تصویر کو جیب میں رکھتا ہوا بولا۔ انو بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''اس شہر میں اور کون ہے ان کا۔؟'' کسی نے سوال کیا۔

''کوئی رشتے دار ہیں۔۔''

''صاحب کے یا میم صاحب کے؟''

''دونوں کے۔۔''

''یہاں آتے ہیں؟''

''نہیں جی۔۔''

''کیوں؟''

''معلوم نہیں جی۔۔''

''آپ کتنے سال سے ہو ادھر؟ کیوں معلوم نہیں؟''

''آپ میرے کو معاف کردو جی۔۔ میرا من دکھی ہے۔۔ پریشان مت کرو آپ میرے کو ۔۔ادھر سے جاؤ۔'' انو روپی اور ہچکیاں لیتی وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ کیمروں نے سارا

منظر پل پل محفوظ کرلیا۔ سارا دن ٹیلیوژن کے کئی چینل اس خبر کو دہراتے رہے۔

'' تم نے دیکھا تھا جب بچے اسے ہسپتال کے جا رہے تھے۔؟''
اگلی صبح مسز ملہوترا نے ہاتھ گاڑی میں سے سبزیاں پسند کرتے ہوئے کسم سے پوچھا تھا۔
''ہاں۔۔۔ لڑکی سی لگ رہی تھی۔''
''کیا پہنا تھا۔؟''
'' ٹریکس میں تھی۔۔شاید بیٹی کے ہوں۔۔۔ بالکل سلِم کردیا تھا اس نے خود کو۔۔''

'' میرے کو تو بھیا اس کے گھر کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔۔۔۔۔۔''
مسز ملہوترا نے جیسے کہ شانوں میں سر چھپا کر
کہا اور بند گوبھی کے ایک بڑے سے پھول کو الٹ پلٹ کر واپس رکھا اور دوسرا اٹھایا۔
'' میرے کو بھی۔۔۔'' کسم نے آنکھیں گویا کہ خوف سے پھیلا کر مسز ملہوترا کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر آلوؤں کی ڈھیری میں سے بڑے بڑے آلو علیحدہ کرکے ترازو میں ڈالنے لگی۔

چندر کانت ناگپال اور روہنی ناگپال کے جسد خاکی گھر نہیں لے جائے گئے۔ ہسپتال سے شمشان گھاٹ لے جائے گئے جہاں کچھ رشتہ دار موجود تھے۔ مِنی کو گھر سے ماں کا سہاگ کا جوڑا منگوانے کو کہا گیا۔ راہل کو پروہت رسوم کے بارے میں بتاتا گیا۔ وہ دونوں بہن بھائی روبوٹ کی طرح جیسا کہا جاتا ویسا کرتے۔
شمشان میں پہلے سے تین چتائیں جل رہی تھیں یا جل چکنے کے مراحل میں تھیں۔ ان کے

لواحقین اگلے دن آکر استھیاں لیجانے کے لئے جا چکے تھے کہ جل کر خاک ہونے کا عمل طویل ہوتا ہے۔ روہنی ناگپال کے خون نچڑے سیاہی مائل نیلے جسم کو پروہت کی ہدایت کے مطابق رشتہ داروں سے دلہن کا سنگھار کروا کر چتا پر رکھ دیا گیا۔ سہاگن کی مانگ میں سندور تھا۔ ماتھے پر بڑی سی سرخ بندیا لگی تھی۔ اور جسم پر زری کی سنہری ساری تھی۔ برابر میں چندر کانت ناگپال کی چِتا تیار کر دی گئی تھی۔

چتائیں سجاتے ہوئے پروہت دھیمی آواز میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔

راہل اور منی ماں کی چتا کے پاس تھے۔ منی آنسو بہاتی ماں کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر دیکھتی۔ بیٹھتی کبھی کھڑی ہو جاتی۔ پیروں کی طرف جاتی اور دونوں پاؤں تھام لیتی۔ کوئی آکر اسے اٹھا دیتا۔ سہارا دے کر ذرا دور لے جاتا۔ وہ وہاں سے ماں کے چہرے پر نظریں گاڑھ دیتی اور پھر قریب چلی جاتی۔ آہستہ آہستہ کانپتی ہوئی۔ باریک سی آواز میں زیرِ لب ماما پکارتی سر کی جانب جاتی کبھی پاؤں کی اور۔

ماتھے کا زخم اب سیاہ نظر آرہی تھا۔ گلے کا زخم پوسٹ مارٹم کے دوران ڈاکٹروں نے ایسے سیا تھا جیسے کوئی کپڑے پہ عجلت سے ٹانکے لگانے کے دوران دونوں اطراف جوڑ کر سوئی اوپر سے پروتا جائے۔ منی نے گردن کے زخم پر ساری برابر کی اور جلدی جلدی ہچکیاں لینے لگی۔ پھر ماں کا بے جان ہاتھ سہلاتی رہی۔ اس کے بعد پیشانی۔ اس کا اپنا سارا جسم ہچکولے سے کھا رہا تھا۔

راہل پتھر کے بت سا دانت بھینچے پروہت کا کہا کر رہا تھا۔ باری باری دونوں چتاؤں کی طرف جاتا۔ پھر منی کے پاس جا کر اس کا سر سہلاتا۔ آنسو اس کے چہرے کو بھگوتے ہوئے اس کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔

چتاؤں کو بیشمار لکڑیوں سے ڈھک دیا گیا۔

پروہت جی نے چتاؤں کو اگنی دینے کا اعلان کیا۔

اور چتاؤں کو پرنام کرنے کو کہا۔ وہ ہاتھوں کو جوڑے ماں کے قریب گئے، پھر باپ کے جو لکڑیوں کے پیچھے سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ رشتہ دار تھوڑی دور سے ہاتھ جوڑے نمسکار کر رہے تھے۔ کچھ ہمسائے بھی موجود تھے جو انتم سنسکار کے بارے میں اطلاع حاصل کر سکے تھے۔ کوئی خاموش تھا، کوئی رو رہا تھا۔

چتائیں جلنے لگیں۔۔

سہاگن کی چتا پر زری کے جلتے ہوئے جوڑے نے دھنک رنگ شعلے بکھیر رکھے تھے۔

راہل نے منی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

'' ماما کتنی سندر لگ رہی ہیں منی ۔۔منی ۔۔اَ وَر مام از ڈائنگ بیوٹیفلی۔۔۔۔۔''

اس نے ایک زور کی ہچکی لے کر ہونٹ دوبارہ بھینچ لئے تھے۔

احاطے میں دھواں سا پھیل گیا تھا۔

چتائیں جلتی رہیں۔

رشتے داروں نے جانا شروع کر دیا تھا۔

منی اور راہل کے دوستوں کے علاوہ جگنو بھی وہیں تھی جو کبھی انہیں سہارا دینے کی کوشش کرتی کبھی خود رو پڑتی۔ شو کمار شریواستو غالباً خودکشی نامے میں اپنے ذکر کے سبب وہاں موجود نہیں تھا مگر اس نے اوپری سطح پر مداخلت کروا کے ہسپتال سے دونوں جسدِ خاکی سیدھا کریا کرم کے لئے لیجانے کا کام کروایا تھا۔ جس وجہ سے پولیس اور میڈیا کے علاوہ پاس پڑوس کے لوگوں کے سوالات اور مداخلت کی ممکنہ پریشانی سے بچوں کو نجات حاصل ہو گئی تھی۔

چار روز کے وقفے کے بعد رسمِ پگڑی کے دن چندر کانت ناگپال اور رجنی ناگپال کی کسی زمانے میں ساتھ لگ کر کھچوائی گئی تصویر ایک بڑے سے فریم کے اندر تازہ سرخ گلابوں کی

مالا سے مہکتی ان کی رہائش گاہ سے کچھ فاصلے پر تعمیر مندر میں بھگوان کے چرنوں کے پاس رکھی تھی۔ پاس ہی گلاب کی پتیوں سے بھری ٹوکری تھی۔

بڑی بڑی ذہین آنکھوں والی ایک متین سی سادھوی نیم مُندھی آنکھیں کہیں دور گاڑے نہایت سریلی آواز میں رام بھجن گا رہی تھی۔ اور پھر آنکھیں پوری بند کر کے زندگی اور موت کے فلسفے کو بڑی سادگی سے بیان کر رہی تھی۔ دکھ بھوگنے کی شکتی کی بابت سمجھا رہی تھی۔ شریر کے مٹی سے قریب ہونے کا ذکر کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد سادھوی نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

-------اور ہے ارجن، تم بھی یہ سمجھ لو گے کہ آتما لگاتار جنم لیتی اور مرتی ہے تو اس طرح غم سے نڈھال نہ ہو گے۔

کیونکہ جو جنم لیتا ہے اسے اوشئیہ موت آتی ہے اور مرنے والا جنم بھی اوشئیہ ہی لیتا ہے۔ سو ایک نہ ٹلنے والے واقعے کا کیا غم کرنا۔

---اس لئے ہمیشہ اپنے کام موہ مایا میں پڑے بنا اچھی طرح کرو۔ موہ میں پڑے بنا کام کرنے سے منشیہ بھگوان کو پا لیتا ہے۔۔۔

---ہے ارجن، آتما جو سب کے شریر میں رہتی ہے اسے کبھی مارا نہیں جا سکتا۔ اس لئے تمہیں کسی کے پرانوں کا دکھ نہیں کرنا چاہئے۔۔

---جس بدھی مان کا من دکھوں میں پریشان نہ ہو، سکھوں کے لئے جس کی ترشنا ختم ہو گئی ہو، اور جو موہ، بھئے اور کرودھ سے مکت ہو گیا ہو، اسی کا من ستھر ہوتا ہے۔

سادھوی حاضرین کو باری باری دیکھتی ہوئی بھگود گیتا کے شلوک سنا رہی تھی۔
لوگ جمع ہو رہے تھے۔ کچھ بزرگ دیواروں سے لگی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ باقی ہال کے فرش پر۔
پچھلی قطار میں کوئی سرگوشی میں باتیں کر رہا تھا۔ جو بالکل قریب بیٹھے ایک آدھ شخص کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔
'' تصویر میں دونوں کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔۔۔'' یہ آواز عورت کی تھی۔
''ہاں۔۔حالات کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔۔'' یہ آواز مردانہ تھی۔
''ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہونگی۔۔۔ جو پوری ہوگئی۔۔''
''یہ تو زبردستی ہوا نا۔۔کوئی بھگوان کی دی ہوئی موت تھوڑی تھی۔۔'' مرد نے کہا تھا۔
''ایسا ہونا ہی تھا۔۔۔''
''کیوں ہونا تھا۔۔۔؟''
''جانتی ہو راہل کی ماں نے بھی آتم ہتیا کی تھی۔۔''
'' کیا کہہ رہے ہو۔۔؟''
''ہاں۔۔جن دنوں چندر کانت پر روپنی کا بھوت سوار تھا، وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ ایسے ہی جیسے پچھلے دنوں چندر کانت رہا کرتا تھا۔ وہ رشتہ ان کے گھر والوں نے کاروبار کی خاطر کیا تھا۔ لاہور سے مائیگریٹ ہونے کے بعد انہیں قدم جمانے کے لئے سہارا درکار تھا۔ جو ایسے سمدھیانے سے بہ آسانی ملنے کی توقع تھی۔ شکنتلا کے والد پانی پت کے مشہور ایکسپوٹر تھے۔ اون کا پشتینی کاروبار تھا ان کا۔ تعلقات کا پاس رکھنے والے سنسکاروں والے لوگ تھے۔ اور دونوں خاندان پہلے سے آپس میں کچھ جانکار بھی تھے۔ اس بات کا فائدہ اٹھایا تھا ناگپالوں نے۔ مگر چندر کانت اس شادی سے کچھ خوش نہیں تھا۔۔ وہ شکنتلا سے ہمیشہ کھچا

کھچا سا رہتا۔ راہل کی پیدائش پر کچھ خوش نظر آنے لگا تھا۔ لگتا تھا شائد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر اس نے روہنی کو کہیں دیکھ لیا۔ اور ہمیشہ کی طرح خاموش رہنے لگا۔ کوئی پوچھتا تو توڑ پھوڑ پر اتر آتا تھا۔ ایک دن اس نے گھر میں اعلان کر دیا کہ اس نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ اور وہ شادی کرنے والا ہے۔''

''پاگل تھا۔۔؟۔۔۔شادی شدہ ہو کر۔۔''

''ہاں پاگل ہی تھا۔۔شکنتلا بیمار پڑی اور تندرست ہی نہ ہوئی۔۔''

''شاید ہونا ہی نہ چاہتی ہو بے چاری۔۔۔۔۔''

''شاید۔۔۔تین دن تک بے موسم کی ایسی برسات ہوئی تھی۔۔کہ سکولوں میں چھٹیاں کر دی گئی تھی۔۔ وہ موت خاندان میں کوئی نہیں بھولے گا۔ ان کے گھر ہی کے باہر صدیوں پرانا ایک برگد جڑ سے اکھڑ گیا تھا۔ طوفان سا برپا کر دیا تھا موسم نے۔۔جیسے آسمان بھی غم و غصے میں مبتلا ہو۔ ساری برادری نے ماتم کیا تھا شکنتلا کی موت پر۔۔۔چندر کانت کے گھر والوں نے تک اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ یہ شادی اس نے گھر سے نکالے جانے کے بعد ہی کی تھی۔ شکنتلا کو کئی دن نیند نہیں آتی تھی۔۔پھر ایک رات اس نے کئے پتوں میں سے نیند کی گولیاں نکال کر نگل لیں اور پانی سے بھرے باتھ ٹب میں لیٹ گئی تھی۔''

''ہے بھگوان۔۔۔یہ آدمی کیا سب کو کشٹ دینے کے لئے جنما تھا۔۔''

''خود بھی تو کشٹ میں تھا۔۔''

''اپنے ہی پاگل پن کے کارن نا؟''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔۔؟ تم اس کے درشٹیکون سے سوچو۔۔۔اس کے ساتھ بھی تو برا ہوا۔۔''

''پہلے کی چھوڑو۔۔۔اس دفعہ۔۔''

''کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔۔وہیں سے تو ساری بات شروع ہوتی ہے۔۔۔''

’’ میرا مطلب ہے اگر اسے کام میں رُچی ہوتی تو کیوں رونی کو کام کی تلاش میں جانا پڑتا۔۔نہ وہ باہر نکلتی۔۔نہ وہ انسکیور ہوتا۔۔‘‘

’’ وہ اس کے کام کرنے سے نہیں اس کی حرکتوں سے پریشان تھا۔۔۔‘‘

’’ مطلب۔۔؟ تم سب مرد ایک جیسے انداز سے سوچتے ہو۔۔میں تمہیں عام مردوں سے الگ سمجھتی تھی۔۔تم بھی ایسے سوچو گے تو۔۔تو اور لوگ پھر کیا کہتے ہونگے۔۔۔ہے بھگوان۔۔‘‘ عورت نے لمبی سانس لی۔

’’تمہارا مطلب ہے سب جھوٹ تھا ۔۔چندر کانت بنا کارن کے پگلا گیا تھا۔۔‘‘

’’ ہاں جھوٹ ہی ہوگا ۔۔مگر اگر سچ بھی ہوتا تو بھی۔۔اسے کسی طرح رونی کی جان لینے کا ادھیکار نہیں تھا۔۔اس کے اپنے ساتھ تو ایسا ہونا ہی تھا۔۔‘‘

’’ ہاں۔۔۔شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔۔اسے تو اپنے پاپ کا بدلہ چکانا ہی تھا۔۔‘‘

’’ ہاں سنسار کا یہ ہی سنتولن ، یہ ہی بیلینس ہے جو بھگوان کی شکتی پر اٹوٹ وشواس کا کارن ہے۔۔‘‘

’’ہاں شاید ۔۔۔جو جیسا کرے۔۔ویسا بھرے۔۔‘‘

سادھوی خاموش ہوگئی تھی۔ پنڈت جی نے مائک سنبھالا۔۔منتر پڑھے۔

’’بھگوان ان دونوں کی آتما کو مکتی دے۔تا کہ یہ دوبارہ جنم لینے کا کشٹ نہ بھوگیں۔۔‘‘ پنڈت جی نے ہاتھ پرنام میں جوڑ کر کہا اور اپنی نشست سے اٹھ کر فرش پر ایستادہ ہوگئے۔

’’اب پگڑی کی رسم کے لئے راہل ناگپال آگے آئے۔۔۔۔۔‘‘ وہ بولے۔

زرد چہرے پر سفید صافہ باندھا گیا۔۔۔

'' کہاں تو وہ اس کے سر پر سہرا دیکھتے اور کہاں ۔۔ یہ۔۔'' آخری قطار میں بیٹھی عورت کی آواز میں سسکیاں شامل ہو گئیں۔

''ہاں ۔۔۔ مُرجھا گئے ہیں بچے بیچارے ۔۔۔'' مرد کی آواز میں اداسی تھی۔

راہل اور منی جوڑے ہوئے ہاتھ ٹھوڑی سے لگائے دروازے کے قریب گویا آنے والوں کا شکریہ ادا کرتے نمسکار کر رہے تھے اور لوگ ٹوکری میں رکھی گلابوں کی پتیاں تصویر پر چڑھا کر دونوں کو پرنام کرتے نکل رہے تھے۔

آخری قطار والے مرد اور عورت سب سے آخر میں باہر نکلے۔

'' مگر سنو۔۔ ان بچوں کا کیا قصور تھا۔۔ جو بھری دنیا میں ۔۔ اس طرح ۔۔۔'' مرد نے گردن بائیں جانب موڑ کر عورت کی طرف دیکھا۔

''ہاں ۔۔۔ میں بھی ۔۔۔۔۔ یہی ۔۔۔۔۔ سوچ رہی تھی ۔۔۔''

عورت نے ہچکی لے کر آہستہ سے کہا۔

...............تمام شد...............

یمبر زل

تمہاری چپ سے نہ ہم پر سکوت چھا جائے
اندھیری رات کے ویران مقبروں کی طرح

اس انجام کا خدشہ سب کو تھا مگر اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ ماں اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ باپ اسے قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ یاور ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور عنیقہ......

''نِکی باجی...... یہ الجیبرا مجھے ضرور فیل کرے گا......'' یوسف نے پھرن کے اندر سے آگ بھری کانگڑی باہر نکال کر سبز گل بوٹوں والے سرخ قالین کے عین درمیان رکھ دی۔
''ہم سے تو یہ نہ ہوگا...... نہ ہم پاس ہوں گے۔'' وہ لانبی لانبی انگلیوں سے آڑھی مانگ کے دونوں اطراف کنگھا کرنے لگا اور گردن اُچکا کر دیوار میں لگے بڑے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے گنگنانے لگا۔
''چوپ...... چوپ......'' نِکی کی خاص کوشش کے بعد بھاری بنائی ہوئی آواز گونجی۔
''چُپ چاپ بیٹھے رہو...... کانگڑی اٹھا کر کنارے نہیں رکھ سکتے تم یوسف، کسی کی ٹھوکر لگ گئی...... تو......؟''

''نکی باجی۔ یوسف بھائی تو خوامخواہ کانگڑی گود میں اُٹھائے پھرتے ہیں...... اب ایسی سردی تو ہے نہیں۔ ابّو نے اس کمرے میں اسی لیے بخاری نہیں لگائی کہ ہم سب چُست رہیں گے

اور پڑھنے میں مصروف رہیں گے..... خوب سارے کپڑے پہن کر کہاں لگتی ہے سردی...... کانگڑی پھرن کے اندر ٹھونس کر جمائیاں لیتے رہتے ہیں..... جب دیکھو..... خاک پڑھیں گے.....؟''

یاور نے کتاب پر جھکا سر اُٹھا کر نکی کے چہرے پر اپنی طرف سے بڑی اہم بات کہہ کر ردِ عمل جانچنے کی کوشش کی۔ اور ایک نظر آئینے میں یوسف کے عکس کو دیکھ کر نتھنے سکیڑے پھر ابرُو اوپر کو کھینچے اور دانت نکوس کر بغیر آواز ہنسا اور کتاب پر ایسی عجلت سے جھکا جیسے بہت ضروری سبق ادھورا چھوڑنا پڑا ہو۔

''آپ سے کس نے رائے مانگی تھی.....'' نکی نے آواز میں بھرا ہوا رعب ذرا کم کر کے کہا۔ ''آپ اپنا کام کیجئے.....'' وہ بولی۔ ''ادھر لاؤ کتاب یوسف..... ابھی تو سمجھایا تھا یہ سوال تم کو.....'' نکی نے لمبا سا رجسٹر اور کتاب اپنی طرف سرکائے تو یوسف فرش پر کہنیوں کے بل لیٹ گیا اور رجسٹر پر نظریں گاڑھ دیں۔ ''اوپر اُٹھو یوسف..... سونے کی تیاری مت کرو نا..... میرا ابھی کل پیپر ہے..... پلیز.....'' نکی فوراً دبلی پتلی سی باریک آواز والی لڑکی بن گئی۔ اور یوسف جیسے کہ ہوش میں آ گیا۔ ''اوہ..... Sorry نکی باجی..... ایک بار اور کوشش کرتا ہوں.....'' یوسف نے رجسٹر اور کتاب اپنی طرف سرکائے۔ کچھ لمحے نکی کی طرف دیکھتا رہا۔ گلابی جلد والا کتابی چہرہ۔ لمبی سی آنکھوں پر چھوٹا سا بغیر فریم کا چشمہ۔ رخسار پر کان کے پیچھے سے آنے والے بالوں کی ایک پتلی سی لٹ۔ اور کان میں چھوٹی سی سنہری بالی۔ دوسری بالی اُس زاویئے سے نظر نہیں آتی تھی۔ باقی بال سر کے پیچھے کی طرف موٹے سے سیاہ ہیر بینڈ میں پھنسے تھے۔ دودھ ایسی سفید گردن پر دو ایک لاجوردی نسیں۔ اور گردن کے ساتھ لگا سیاہ رنگ کے سویڈ کے موٹے سے کپڑے پر بغیر کڈھائی کے کالر والے پھرن کا بند زپ۔ کلائی تک آتی ہوئی آستین میں سے جھانکتے نازک ہاتھ میں قلم۔ سامنے کئی کتابیں اور کاپیاں بکھری ہوئیں۔ ''کیا سوچ رہے ہو اب..... تم۔'' نکی نے اُسے کچھ پل لگاتار دیکھ کر

پوچھا۔ ''نہیں...... کچھ نہیں نکی باجی......'' وہ جلدی سے بولا اور کتاب پر جھک گیا۔ نکی نے دیوار سے ٹیک لگادی اور تلوے فرش پر رکھ کر موڑے ہوئے گھٹنوں پر کتاب پھیلا دی۔ تینوں سر کتابوں پر جھک گئے۔ نکی یاور کی بڑی خالہ تبسم بیگم کی اکلوتی اولاد تھی۔ یاور کی ماں تنویر بیگم کی لاڈلی بھانجی، جو کچھ دن اپنی خالہ کے یہاں رہنے آئی تھی۔ بلکہ اس کی موجودگی میں اُس کا خالہ زاد بھائی یاور بھی پڑھنے کے معاملے میں ذرا سنجیدہ ہوجایا کرتا تھا۔ وہ جماعت ششم کا طالب علم تھا۔ نکی گیارہویں درجے کی طالبہ تھی۔ کچھ مہینوں پہلے تنویر بیگم اپنے جیٹھ کے بیٹے یوسف کو بھی اپنے یہاں لے آئی تھیں کہ وہ کچھ شرارتی واقع ہوا تھا اور تنویر چچی سے بہ نسبت اپنے والدین کے زیادہ مانوس تھا۔ ''نکی باجی آپ خود تو پڑھ نہیں رہیں......'' یوسف نے سر ذرا اونچا کر کے نکی کی نوٹ بک دیکھنے کی کوشش کی۔ ''شاعری کر رہی ہوں گی نکی باجی۔'' یاور نے بغیر سر اٹھائے کہا۔ ''تم لوگ میرے استاد ہو یا میں تمہاری۔ چپ چاپ اپنا کام کرو...... ورنہ ایک ایک تھپڑ......'' ''آج تو آپ یوسف بھائی کے ایک تھپڑ جڑ......'' ''چپ بے ایک تھپڑ کے بچے...... نکی باجی صرف دھمکاتی ہیں...... ماریں گی تھوڑے ہی......'' ''اب جس نے بات کی نا...... تو ساری دھمکیاں سچ ہوجائیں گی۔ سمجھے تم لوگ...... اتنا اچھا شعر ہوا ہے...... مگر تم لوگ سوچنے کی مہلت دو تو نا......'' ''تو سنا دیجئے نا نکی باجی...... پلیز...... ورنہ یوسف بھائی بڑے خالو سے کہہ دیں گے......'' یاور اپنا چھوٹا سا گورا ہاتھ ہونٹوں پہ رکھ کر ہنسا۔ نکی نے اس کی طرف نتھنے پھلا کر اور آنکھیں سکیڑ کر دیکھا پھر دانت بھینچے۔ شہادت کی انگلی ناک پر رکھی اور آواز بھاری کر کے کھنکھارا کی۔ ''خاموش......'' اُس نے سر جھٹک کر کہا اور تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نکی نے تازہ ترین شعر سنایا اور یاور نے ہاتھ لہرا لہرا کر داد دی:

چھوڑ جانے سے پہلے، تصور ترا
ہے مجھے بھی بتانا کہاں چھوڑنا

''واہ نکی باجی۔ یہ اُسی غزل کا شعر ہے نا...... جو آپ نے کل سنائی تھی......''
''ہاں اُسی کا......اور سنائی نہیں پڑھی، کہا جاتا ہے۔'' نکی نے یاور کو سمجھایا۔ یوسف نے نکی کی آنکھوں میں دیکھا۔
''ہاں......

اس سے پہلے پڑے یہ جہاں چھوڑنا
وقت کی ریت پر کچھ نشاں چھوڑنا''

''تم سمجھدار ہو...... ورنہ لوگ تو شعر کا تماشا بنا دیتے ہیں۔''
نکی نے ترچھی نظر سے یوسف کو دیکھا اور یاور کا گال تھپتھپا کر کہا۔
''اللہ...... اتنی سنجیدگی سے داد دی......'' یوسف نے چہرے پر خفگی کے آثار طاری کرنے کی کوشش کی۔

یاور اور یوسف دونوں چچازاد بھائی تھے اس لیے صورتوں میں مشابہت ممکن تھی مگر ان دونوں کے چہرے کافی حد تک ایک سے تھے۔ سیاہ گھنگھریالے بال، سرخ و سفید رنگت، متناسب دانت اور نیلی نیلی پتلیاں۔ دو چیزیں البتہ الگ تھیں کہ یوسف کا قد یاور سے کوئی دو فٹ زیادہ تھا بلکہ وہ تو نکی سے بھی فٹ بھر لمبا تھا اور دوسرے اُس کی مونچھیں اُگ آئی تھیں اور کہیں کہیں داڑھی بھی۔

اُس دن شہر کے سب سے بڑے چوک میں بم پھٹا تھا۔ کچھ فوجی جوان زخمی ہوئے تھے۔ کچھ عمارتیں جلی تھیں۔ ہر روز اسی طرح کا کچھ نہ کچھ ہوا کرتا تھا۔ سکون کی لے پر بجتے وقت میں کچھ ایسا انتشار اُٹھا کہ آٹھوں پہر اُتھل پُتھل ہو گئے۔
یوسف نکی کو گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ اُس کے گھر کو مڑنے والے موڑ پر دھواں اڑتا دکھائی دیا۔ لوگ بے تحاشا ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چوڑی سڑک کی دوسری جانب بستی تھی اور اس

طرف قبرستان۔ دور سے بکتر بند گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ تیزی سے سڑک پر سے غائب ہو رہے تھے۔ گولیوں کی آوازیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔

بھاگتے ہوئے لوگوں میں سے ایک معلوم نہیں کیسے گر گیا۔ اُس کے پیچھے سے آ رہی فوجی گاڑی میں سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ یوسف نے ایک لمحے کے کسی حصے میں دیکھا کہ گرے ہوئے آدمی کے بالکل قریب کوندا سا لپکا تھا اور گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ پھر سڑک پر گرا آدمی کوئی فٹ بھر اُچھلا اور دوبارہ سڑک پر آ رہا۔ یوسف سڑک کے کنارے کی طرف بھاگا۔ اُس نے مضبوطی سے نکی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

یہ سب نکی نے بھی دیکھا تھا۔

سڑک کا کنارہ ختم ہوتے ہی ڈھلان شروع ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں چند قدم اور نیچے کو بھاگے اور منڈیر کے ساتھ لگ گئے۔ نکی نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ ہچکیاں اس کے سینے میں گھٹ رہی تھیں۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ یوسف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنے ساتھ زمین پر بٹھا دیا۔

کئی منٹوں تک وہ دونوں ہانپتے رہے۔ پھر ماحول پر سکوت طاری ہو گیا۔

نکی نے آنکھیں بند کر لیں اور سر پیچھے کو ٹکا دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی سانسیں معمول پر آ گئیں۔ یوسف نے دیکھا کہ سامنے وسیع و عریض قبرستان کے احاطے میں کچھ قبریں ہیں اور بے شمار نرگس کے پھول کھلے ہیں۔

"نکی باجی...... آپ کی رنگت بالکل یمبرزل جیسی ہے۔ یمبرزل کے پھولوں جیسی ہے۔ اگر آپ کا نام یمبرزل ہوتا تو بہت اچھا لگتا۔ جسے یہ لفظ سمجھ میں نہ آتا وہ آپ کو نرگس بلا سکتا تھا...... ہے نا......؟" یوسف ساکت بیٹھا سامنے دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ نکی نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور بائیں جانب گردن موڑ کر اُسے حیرت اور اداسی سے دیکھا۔

"تمھیں موت کے سناٹے میں زندگی کی باتیں کیسے سوجھتی ہیں یوسف؟" وہ بے بس سی

ہو کر بولی۔

''کتنے قریب تو ہیں دونوں...... زندگی اور موت...... دیکھا نہیں آپ نے......''

اُس نے آہستہ سے کہا۔ منڈیر کی اُس طرف سڑک پر کوئی آہٹ ہوئی تو یوسف نے سر ذرا سا اوپر اُچکا کر دیکھا...... سڑک پر گرا آدمی اُٹھ گیا تھا اور لنگڑاتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے دوسرا کندھا تھام رکھا تھا۔

''وہ دیکھئے...... وہ دیکھئے نکی باجی...... میں نے سچ کہا تھا نا......'' یوسف بولا تو نکی نے جھانک کر دیکھا۔

''اللہ...... تیرا شکر...... تو پھر وہ...... یہ...... وہ گولی؟'' وہ اپنے گلے کے قریب ہاتھ رکھ کر بولی۔

''اس کے بازو میں لگی ہو گی...... شانے میں......'' وہ بولا۔

دونوں منڈیر سے لگے بیٹھے رہے۔

''نکی باجی...... ایسا نہیں لگتا جیسے موت کا سکون سے کوئی گہرا رشتہ ہو۔ جیسے موت ہی سکون کا دوسرا نام ہو...... زندگی، موت اور سکون...... سب کا مفہوم ایک ہو گیا ہو...... اس وقت ایسا نہیں لگ رہا۔'' اُس نے نکی کی طرف گردن موڑ کر کہا۔

''ہاں...... شاید......'' نکی نے کچھ توقف سے کہا اور سامنے دیکھتی رہی۔

''نکی باجی......'' اس نے کہیں دور سے پکارا حالانکہ وہ دونوں ساتھ لگے بیٹھے تھے۔

''ہوں......'' وہ بغیر لب وا کیے بولی۔

''اگر اس وقت کوئی ہم پر بندوق تان دے تو......؟''

''تو......؟ ...... کیا؟'' اُس نے گردن موڑ کر یوسف کے چہرے کو دیکھا۔

''تو ہمیں جان بچانے کے لیے بھاگنا چاہئے کیا۔؟'' یوسف نے پرسکون لہجے میں کہا۔

کئی لمحے خاموشی میں گزر گئے۔

''نہیں......'' کچھ دیر بعد نکی نے اُسی لہجے میں جواب دیا اور کچھ اور پل اُس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک لمبی سانس بھر کر سر پیچھے ٹکا دیا۔ دونوں کے ہونٹوں پر ایک ابدی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

جب آگے پیچھے نتیجہ آیا تو نکی چوری چھپے شعر کہنے کے باوجود بہت اچھے نمبر لائی۔ یاور کے بھی اچھے نمبر تھے۔ یوسف بس پاس ہو گیا۔

''اچھی طرح تو حل کر لیتے تھے تم سارے سوالات پھر حساب میں کم Marks کیوں آئے......اسی لیے ڈویژن اچھی نہیں آئی۔ اب تمھیں تمھاری پسند کے مضامین نہیں ملیں گے۔ اب پڑھنا...... سمجھے۔'' نکی نے اُس کا کان دھیرے سے پکڑا اور چھوڑ دیا۔ مطالعے کا کمرہ دوبارہ آباد ہو گیا تھا۔

''Maths کے پرچے کے دوران آپ کی بہت یاد آئی نکی باجی......وہ آخری پرچہ تھا نا...... آپ اُس سے پچھلی شام کو گھر جا چکی تھیں تو میں...... میں......'' اُس نے سر جھکا لیا۔ الٹے ہاتھ پر ٹپ سے ایک آنسو گرا۔

تین چار سال سے لگاتار چلتا آ رہا تناؤ اس سال بھی زوروں پر تھا۔ ہر خطۂ زمیں کی طرح اس وادی نے بھی اپنے حصے کے اُتار چڑھاؤ جھیلے تھے۔

چاہے ہزاروں برس راج کرنے والے ہندو راجاؤں کے دور میں یا طلوعِ اسلام کے بعد ایک ہی خاندان کے سلاطین کشمیر کی سینکڑوں برس کی حکومت میں، یا پھر سلطان زین العابدین کے بعد خانہ جنگیوں سے نجات دلانے والے چک بادشاہوں کے دور میں، ہر بدلتے منظرنامے نے تاریخ کے پنوں پر سرخ حاشیے کھینچے۔ مگر اس بار ایک عجیب سی بے چینی تھی جو کسی طرح قرار نہیں پا رہی تھی......اور زندگی پھر بھی رواں تھی۔

''اس بار سب محنت کریں گے......خود میرا بارہویں کا E x a m ہے......اور وہ بھی سائنس......ماماں سنتی ہی نہیں میری بات...... مجھے بھی محنت کرنا ہے بہت......''
نکی نے ناک سکیڑ کر گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔
''آپ ڈاکٹر بنیں گی......نکی باجی......؟یوسف دھیمی آواز میں بولا۔
''اور کیا......سب ہی پیچھے پڑے ہیں میرے......میں تو آرٹس پڑھنا چاہتی ہوں......چاہتی تھی......''
''اور؟......میں......کیا کروں گا نکی باجی......؟''اُس کی آواز میں افسردگی سی تھی۔
اُس نے بال پوائنٹ کا پچھلا حصہ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور جھکے ہوئے سر اور اٹھی ہوئی نظروں سے نکی کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔
''تم کچھ اچھے مارکس لاتے تو تمھارا ایڈمیشن کامرس میں تو ہو ہی جاتا......اب بھی اگر تم محنت کرو اور اگلے سال بارہویں میں اچھے نمبرات لے آؤ تو کالج میں تم کامرس لے سکتے ہو۔ پھر MBA وغیرہ کر کے تمھارا کریئر......''
''میں ویسے بھی ابو کا سارا کاروبار سنبھالنے والا ہوں......''وہ جیسے بے خیالی میں بولا۔
''مگر Qualified ہو کر سنبھالو گے تو پڑھے لکھے کہلاؤ گے......سب کی نظروں میں......تم محنت کرنا نا......''
نکی اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر قلم اُس کے منہ سے نکال کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔
''ورنہ پھر......جانے نکی باجی کہاں ہوں......اور آپ کہاں ہوں۔''
یاور نے پریشان سے لہجے میں دونوں کو باری باری دیکھ کر کہا......دونوں اسے خاموش دیکھتے رہ گئے۔ وہ دوبارہ اپنی نوٹ بک پر جھک گیا تو ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب

یں تو تو کہاں ابھار رہا ہوں......یں تو آپ کی بے جا م کی الجھیں سمجھانے کی

دیکھا۔ کچھ سیکنڈ یا کچھ منٹ یوں ہی گزر گئے۔ پھر نکی سر جھکا کر اپنی کتاب کو دیکھنے لگی۔

''میں محنت کروں گا...... نکی باجی......''

یوسف نے خالی خالی سی آواز میں کہا۔

''یوسف بھائی بول تو ایسے رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں میں محنت کیسے کروں نکی باجی...... میرے پاس اچھے کاموں کے لیے وقت ہی کہاں ہے۔''

باہر شور مچاتی ہوئی ہوا چلنے لگی۔ برآمدے کی طرف کھلنے والے بھورے رنگ کے دروازے پر ٹیپسٹری کا سفید اور بھوری بیلوں والا پردہ پھول کر کُپا ہو گیا۔

''کیوں نہیں کریں گے...... محنت......'' وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اور کیا۔ جانے ہر وقت کیا سوچتے رہتے ہیں...... جانتی ہیں نکی باجی...... پچھلے سال Exam کے دنوں میں بغیر پڑھے پاس ہوئے ہیں یہ...... آپ تو سونے چلی جاتی تھیں...... یہ میرے ساتھ یہیں پڑھتے تھے نا۔ پڑھتے کیا تھے بس...... یوں ہی...... ایک دن آدھی رات تک آپ کا Side Pose بنانے کی ناکام کوشش کرتے رہے...... نہیں بنا پائے تو کاغذ پھاڑ کر تھوڑا سا روئے۔ اُس کے بعد کتاب ہاتھ میں لی۔ اُسے غور سے دیکھنا شروع ہی کیا تھا کہ...... سو گئے...... ہاہا...... ہی ہی ہی......''

اس دوران نکی چپ چاپ نوٹ بک کی ورق پلٹتی رہی۔ اُس نے دفعتاً بالکنی کی طرف دیکھا۔

''آج برف گرے گی...... یاور...... یہ دونوں تکیے دروازے کے ساتھ لگا دو...... اُف کتنی زوروں کی ہوا چل رہی ہے۔''

''پردہ پھولتا ہے تو الٰہ دین کا جن لگتا ہے۔ ہے نا...... یوسف بھائی۔''

اُس رات جھیلِ ڈل میں واقع دو جزیروں میں سے ایک جزیرے کے بیچ ایستادہ چار چناروں کے درمیان دیودار کی لکڑی کے خوبصورت ریستوراں میں کسی نے آگ لگا دی

تھی۔ سڑک کے اُس پار سرکاری مڈل سکول کی عمارت بھی جل رہی تھی۔

''کرفیو لگا رہا تو کہیں ہمارے Exams اب Postpone ہی نہ ہو جائیں۔'' یوسف نے کتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یوسف بھائی، آپ کی آواز سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ آپ کو تشویش ہو رہی ہے یا آپ اُمید کر رہے ہیں......'' یاور نے بغیر سر اوپر کیے کہا۔ یوسف ہلکے سے مسکرا دیا تھا اور نکی کھونچی آواز میں ہنسی تو اس کی یوسف کے زاویئے سے نظر آنے والے کان کی بالی جھِل مِل کرتی ہلنے لگی۔ پھر اُس نے سر جھکا لیا۔

''ایسے تو وقت ضائع ہو گا......'' نکی نے کہا اور کچھ فکر مندسی نظر آنے لگی۔

''کچھ دن اور پڑھ لیں گے نا......'' یوسف نے آہستہ سے کہا۔

باہر ایک زور کا دھماکہ ہوا اور اوپر ٹین کی چھت کے نیچے، پُتے ہوئے فرش پر مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے دو شیشے چھناک سے ٹوٹ کر گرے۔ نیچے کمرے میں تینوں طالب علموں نے بیک وقت اوپر سیلنگ کی طرف دیکھا۔ لکڑی کے یکساں جسامت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے جوڑ کر بنائے گئے بے شمار دائروں والی ہشت پہلو ختم بند سیلنگ پر بھورے رنگ کا وارنش ہلکا سا چمک رہا تھا۔

''چھت پر شیشہ ٹوٹا ہے کوئی......'' یاور سیلنگ کی طرف دیکھتا رہا۔

''کسی نے کھڑکی کھلی رکھ چھوڑی ہو گی......'' اس نے یوسف کی طرف دیکھا۔

''بتا دوں کیا...... یوسف بھائی...... نکی باجی کو......'' یاور نے کہا تو یوسف کے چہرے کا رنگ پل بھر کو بدلا۔ اور پھر اُس نے واپس اپنے چہرے پر نارمل سے تاثرات لاتے ہوئے کھڑکی کے شیشے سے باہر نظر جما دیں۔ جہاں سفیدے کے درختوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں، جنہوں نے ہریالی جھٹک کر برف اوڑھ لی تھی۔

''درخت ایسے نہیں نظر آ رہے جیسے مردے کفن اوڑھ کر کھڑے ہو گئے ہوں۔'' یوسف نے قہقہہ لگایا۔

''بات کیوں ٹال رہے ہیں یوسف بھائی...... چھت کی پچھلی کھڑکی کے پاس ابھی بھی کرسی پڑی ہے...... جس پر بیٹھ کر جناب چاند کو دیکھ دیکھ کر...... سگریٹ......'' یاور نے نکی کی طرف دیکھا۔

''سگریٹ......'' نکی کانپ سی گئی۔ یوسف نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا اور ہاتھ میں پین لیے کتاب کے چھپے ہوئے حصے کے اطراف سکیچ بناتا رہا۔ کناروں کے قریب ابھی کافی جگہ بچی ہوئی تھی جہاں وہ مزید کچھ چیزیں بنا سکتا تھا۔

''پرابلم کیا ہے تمہاری...... یوسف......؟'' نکی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔ اُس کے لہجے میں غصے سے زیادہ حیرت اور بیچارگی عیاں تھی۔

''اگر آپ مجھ سے چھوٹی ہوتیں نکی باجی تو کیا ڈانٹتیں مجھ کو......؟ یہ بھی تو ایک پرابلم ہے۔ میں اگر آپ سے بڑا ہوتا تو میرا Future پہلے طے ہو جاتا...... اور...... اور......'' یوسف کی بات ادھوری رہ گئی کہ نئے آئے ملازم نے ہتھیلی سے زور زور سے کواڑ کھٹکھٹایا۔

''بی بی جی کھانے کے لیے بُلاتا......'' وہ بڑی بشاشت سے ٹوٹی پھوٹی اردو بولا۔

''تو کیا ہوتا مستقبل کا پتہ چل جانے سے......'' نکی نے گردن خم کی۔

''اصل میں نکی باجی، ان کو لگ رہا ہے کہ آپ آگے آگے بھاگ رہی ہیں اور یہ پیچھے بھاگتے ہوئے گر گر کر اُٹھ رہے ہیں...... آپ Distinction لا رہی ہیں اور یہ بمشکل پاس ہو پاتے ہیں...... خدانخواستہ کہیں فیل ہو گئے...... تو...... پھر......''

''تو پھر...... اور چھوٹا ہو جاؤں گا آپ سے...... میں...... میں...... میرا دل...... ہی نہیں لگتا...... پڑھنے میں......''

''اب زیادہ فلسفہ مت جھاڑو...... پچھلے سال 10th تک تو اوّل آتے تھے...... اصل میں

مجھے ہی پڑھانا نہیں آتا...... میں اب تم لوگوں کو...... آج کے بعد......'' یاور نے جھٹ سے کتاب بند کی۔

''نہیں نہیں نکی باجی...... یوسف بھائی کی غلطی کی سزا مجھے کیوں...... میں تو نہایت شریف آدمی ہوں...... محنتی بچّہ ہوں...... اچھا بچّہ......''

''بالکل، بالکل اُس میں کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں۔'' یوسف نے ہاتھ بڑھا کہ اس کا پہلو گدگدایا تو انگڑائی کے لیے اٹھی ہوئی باہیں گرا کر وہ زور سے ہنسا۔

امتحان ختم ہوئے تو نکی نے بے شمار صفحے سیاہ کر دیئے۔

کالی کالی یہ تقدیر   نیلی نیلی وہ آنکھیں

یا

خواب میرے ہیں کتنے ہرجائی
تیری آنکھوں میں جا کے رہنے لگے

وغیرہ قسم کے...... اور نہ جانے اور کیا کیا۔

اُس دن سورج کی کرنیں چمکیلے آسمان سے ہوتی ہوئی باغیچے میں گر رہی تھیں۔ ٹین کی، ڈھلوان ساخت کی چھت سے برف پگھل پگھل کر بوندیں بن ٹپکتی رہی۔ ہوا کچھ تیز چلنے لگتی تو یہ بوندیں زمین پر گرنے سے پہلے جم جم جاتیں اور فقط کوئی مہین سا قطرہ گرتا، باقی پانی کی مخروطی نلیوں کی صورت رہ جاتیں۔

اونچی دیوار کے باہر سرکاری مکانوں کی قطاروں کے درمیان بنے چھوٹے سے راستے پر بچّے سائیکل چلا رہے تھے۔ آج کرفیو نہیں تھا۔ نکی دھوپ میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ اُس کی ماں تبسم بیگم بھی آئی ہوئی تھیں اور تنویر خالہ کے ساتھ بیٹھی ساگ چن رہی تھیں۔ گیٹ پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''ڈرائیور آ گیا...... بازار ہو آئیں ذرا......ابھی تین گھنٹے کرفیو نہیں لگے گا۔''

تنویر بیگم گیٹ کی طرف پلٹ کر بولیں۔ جہاں ڈرائیور نہیں یوسف ہاتھ میں چابی لیے اندر داخل ہوا۔

''ارے...... میرے بچے......اٹھارہ کا تو ہو جا پہلے......''تنویر بیگم کے چہرے پر پریشانی تھی۔

''اتنی اچھی تو چلاتا ہوں چچی...... پھر میں نے تو کالونی کے اندر ہی ڈرائیو کیا نا......'' وہ مؤدبانہ بولا۔

''اللہ اپنی حفاظت میں رکھے...... تمھیں......'' وہ دوبارہ ساگ چننے لگیں۔

''پھر میں اٹھارہ سے کم لگتا ہوں کیا......'' اُس نے نکی کے قریب جا کر اخبار اٹھاتے ہوئے تنویر بیگم کے پاس بیٹھ کر کہا۔

''نہیں...... ماشاءاللہ وہ بات نہیں بیٹا...... مگر پھر بھی تمھیں......''تنویر بیگم نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''جو بات غلط ہے...... وہ غلط ہے۔ٹھیک کہتی ہیں تنویر......'' نکی کی ماں نے ساگ کے بڑے سے ہرے ہرے پتے پر سے ہرے رنگ کا چھوٹا سا رینگنے والا کیڑا اُٹھا کر باغیچے کی سوکھی گھاس والی بھیگی زمین پر پھینکا۔ دیوار پر سے ایک مینا نیچے اُڑ آئی اور کیڑے کو چُگ کر پھر اوپر کی طرف اُڑ گئی۔

''اُوئی...... ماماں......'' نکی نے جھرجھری سی لے کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

''مطلب......؟''تبسم بیگم کی تیوری چڑھ گئی۔

''ڈرتی ہو......؟...... کیڑوں سے......؟''تبسم بیگم نے حیرت، حقارت اور تشویش کو نہایت کمال سے اپنے لہجے میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے نتھنے پھول گئے تھے۔

''تم Frog کو Disect کرتی ہو Lab میں......؟''انھوں نے آنکھیں پھیلا کر منہ ادھ کھلا

چھوڑ دیا۔

''کل کو Human Body کو کیسے Disect کرو گی تم...... بولو......؟''

اُنہوں نے سر پکڑ لیا۔

''میری اُمیدوں پر پانی پھیر دو گی...... میرا ادھورا خواب پورا نہیں کرے گی یہ لڑکی...... یہ ڈرپوک لڑکی...... مجھے پہلے ہی خدشہ تھا اس کی طرف سے......'' انھوں نے تنویر بیگم کی طرف دیکھ کر آواز میں دُکھ بھر کر کہا اور جلدی جلدی پلکیں جھپکنا شروع کیں، گویا آنسو پی رہی ہوں۔ پھر سر کو مزید جھکا کر ساگ بیننے لگیں۔ سب اُنہیں خاموش دیکھتے رہے۔

''نہیں...... ماماں...... جو آپ کہیں گی...... میں وہی کروں گی۔'' نکی روہانسی ہو کر بولی۔ یوسف نے اخبار کا صفحہ پلٹا۔

اگلے برس جس دن برفانی طوفان نے بہت سے درختوں اور کئی مکانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اُس دن تک اور بہت سی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

امتحانوں کے نتائج آ چکے تھے۔ یاور اچھے نمبروں سے پاس ہو کر نئی جماعت میں آدھا برس گذار چکا تھا۔ یوسف فیل ہو گیا تھا اور اُس کے گھر والے اُس سے نالاں تھے۔ نکی ماماں کی نگرانی میں Enterence کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

پڑھنے کے کمرے میں یوسف اور یاور رہ گئے تھے۔

''نکی باجی کو یہاں بیٹھ کر کتنا اچھا لگتا ہو گا۔'' یاور نکی کی جگہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''تم اپنی جگہ بیٹھو نا...... بڑوں کی جگہ نہیں بیٹھتے...... اگر اس وقت نکی باجی آ گئیں تو کیا سوچیں گی کہ میری جگہ بیٹھ گیا ہے یاور...... شاید نہیں چاہتا کہ میں کبھی آ کر پھر اس جگہ بیٹھوں۔''

یوسف نے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا تو یاور اُچھل کر اپنی نشست پر پہنچ

گیا جیسے اُس کی نکی باجی آ ہی گئی ہوں۔

''ارے باپ رے...... Sorry یوسف بھائی......''

یوسف لمبے سے رجسٹر پر جھک گیا۔

نکی کے بائیں کان کی بالی جھل مل کرنے لگی۔

بالوں کی لٹ نے آدھا رخسار چھپا لیا۔

نکی دانتوں میں قلم دبائے، پھولوں والے ہیئر بینڈ میں بال سمیٹ رہی ہے۔

رجسٹر کے تین صفحوں پر حساب کا ایک ہی سوال حل کیا گیا ہے۔ ایک سیاہ روشنائی سے...... نکی کے ہاتھوں۔ دوسرے دو صفحوں پر یہ ہی سوال یوسف نے حل کرنے کی کوشش کی ہے جس پر نکی نے سرخ قلم سے تصحیح کی ہے۔ صفحے کے کنارے پہ دو آنکھیں بنی ہیں۔ ابھی ابھی یوسف نے پنسل سے بنائی ہیں۔ کالی کالی پتلیوں والی دو آنکھیں۔

نیلی آنکھوں میں پانی تیر رہا ہے...... اگر پلک جھپک دی گئی تو...... آنسو چہرے پر اُگی چھوٹی چھوٹی داڑھی میں سے ہوتا ہوا گردن پر بہہ نکلے گا...... اور کہیں یاور دیکھ لے تو...... اُس کا دل اُداس ہو جائے گا۔

لیکن یاور نے یوسف بھائی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔

مختصر سی غلام گردش میں یاور کی باتوں کی آواز گونجی تو زینے پر نکی کے تیز تیز اٹھتے ہوئے قدموں کی آواز اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر آتی ہوئی ماں سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''Sorry Maama''

''ابھی چوٹ لگ جاتی تو؟ کل آخری پرچے کے دن تم......''

''تو Rest کر لیتی ماماں...... میری ساری Preparaton تو ہو چکی ہے آج تو میں کئی گھنٹے

کی نیند بھی Afford کر سکتی ہوں ۔۔۔ یہ جناب کدھر سے راستہ بھول گئے ۔۔۔'' وہ مسکراتی ہوئی بولتی چلی گئی۔

''اللہ نے میری سن لی۔۔۔ خالہ۔۔۔'' یاور نے تبسم بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ نکی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ابروؤں کے درمیان ایک لکیر کھنچی تھی۔ تبسم بیگم اس کی طرف پلٹیں تو وہ نکی باجی کو دیکھنے لگا۔

''اسلام وعلیکم نکی باجی۔۔۔ آنکھوں کے گرد کے گڈھے بتا رہے ہیں کہ خوب پڑھائیاں ہو رہی ہیں۔۔۔ بلکہ ہو چکی ہیں۔۔۔ کچھ اپنا یہ چھوٹا سا بھائی بھی یاد ہے۔۔۔ کل میرا Maths کا Exam ہے۔۔۔'' وہ فکرمند نظر آنے لگا۔

''صرف ایک گھنٹہ چاہئے آپ کا نکی باجی۔۔۔ آپ اپنی books لے چلئے۔۔۔ وہیں Revise کر لیجئے گا۔۔۔'' وہ تبسم بیگم کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''خالہ آج نکی باجی کو بھیج دیں میرے ساتھ۔۔۔ قسم سے بالکل کچھ نہیں آتا مجھے۔۔۔ فیل ہو جاؤں گا خالہ۔۔۔ رہی سہی عزت خاک میں مل جائے گی۔''

''چپ۔۔۔ بدمعاش کہیں کا۔۔۔ تو تو ماشاءاللہ خود قابل لڑکا ہے۔ اس کا تو بیٹا Last۔۔۔''

''خالہ آپ یقین کریں یہ آٹھویں درجے کا Maths اس قدر مشکل ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور پھر نکی باجی بے چاری جیسے قید بامشقت کاٹ رہی ہیں۔ ان کی بھی کچھ Outing ہو جائے گی۔۔۔ امی نے تاکید کی تھی خالہ۔۔۔ کہ نکی باجی کو کچھ روز کے لیے ساتھ لے آؤں۔۔۔ امی نے انھیں خواب میں دیکھا تھا۔۔۔ یاد کر کے تڑپ رہی تھیں۔۔۔ آپ کو میرے سر کی قسم خالہ۔۔۔''

یاور نے تبسم بیگم کا ہاتھ جھٹ اپنے سر پر رکھ لیا۔

تنویر بیگم نے نکی کو گلے سے لگایا تو وہ ان کی باہوں میں جیسے غائب سی ہو گئی۔

''میری بچی......میری جان...... یہ کیا مصیبت ہے یہ Enterence۔اُف ننھی سی جان......''

نکی اُن کے سینے سے لگی رہی۔ تنویر خالہ کے پیچھے کوئی چھ قدم کے فاصلے پر ادھ کھلے دروازے کی دہلیز میں کھڑے یوسف کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ خالہ کے کندھے کے اوپر سے ہوکر نکی کی نگاہیں جب اس سے ملیں تو وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ پھر دبیز سرخ قالین پر دو قلابازیاں کھائیں اور نکی کی نشست کے تکیے کا غلاف درست کرنے لگا۔

اُس رات ساتویں کے چاند کی پھیکی چاندنی میں ٹین کی چھت والا مکان ہلکی ہلکی چمک بکھیرتا پُرسکون سو رہا تھا۔

صرف پڑھنے کا کمرہ روشن تھا۔

یاور پڑھتے پڑھتے حساب کی کاپی پر رخسار رکھ کر سو گیا۔

''صرف دس منٹ تک آرام کر سکتے ہو......تم؟ نکی نے اُس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ اُس نے دھیرے سے آنکھیں نیم وا کیں اور پھر موند لیں۔

''پھر دو آخری سوال......اور چھٹی......تمہاری تیاری مکمل ہے......'' وہ بولی۔ یاور نیند کے جھونکوں کے درمیان ایک پل کو ہلکے سے مسکرایا اور دوسرے پل کمرے میں اُس کے چھوٹے چھوٹے خراٹے گونجنے لگے۔

وہ دونوں اسے چپ چاپ دیکھتے رہے ان کے چہروں پر بھی ایک پرسکون سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''اب......کیا کرو گے......یوسف......'' نکی کا چہرہ اُداس ہو گیا۔

''اب کیا ہوگا......نکی باجی......اب کیا ہو سکتا ہے......آپ......آپ......'' دور کہیں مشین گن نے لگاتار کئی گولیاں برسائیں۔

باغیچے میں ایستادہ سفیدے کے درختوں میں کوّے یہاں وہاں اُڑ کر کائیں کائیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ماحول پر دوبارہ سکوت چھا گیا۔

''میں اور پیچھے رہ گیا نکی باجی...... ہم ساتھ نہیں چل سکیں گے نا...... اب...... اور کوئی راستہ نہیں نا...... اب اور کچھ نہیں ہو سکتا نا...... ہے نا...... نکی باجی......''

یوسف کی آواز کا کرب واضح ہو گیا تھا۔ نکی نے سر بہت زیادہ جھکا لیا تھا۔ وہ سوئے ہوئے یاور کے بالوں میں انگلیاں پروتی رہی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اُس کے حلق کے قریب دوپٹے میں جذب ہوتے گئے۔

''آپ کچھ نہ بولیں گی نکی باجی...... میں جانتا ہوں......'' اُس کی تھکی ہوئی آواز میں شکوہ ہی شکوہ تھا۔

''مگر میں بھی...... نہیں رہوں گا...... نکی باجی......'' اُس کی آواز یکایک تیز ہوگئی۔

''...... چلا جاؤں گا...... میں......'' آواز پھر مدھم ہوگئی تھی۔ نکی نے سر اُٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پریشان پریشان سے چہرے پر ویران ویران سی آنکھیں۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ داڑھی کچھ گھنی ہوگئی تھی۔ اتنی کہ سرخ و سفید چہرے پر ایک سیاہ حاشیہ بنا کر اسے مزید خوش شکل بنا رہی تھی۔

آنسو بہہ نکلے تھے۔

''چلا جاؤں گا...... دور...... آپ سے...... اتنا دور کہ...... کہ......'' اُس نے دبی دبی سی ہچکی لی۔ نکی نے بے اختیار اپنے گلے پر ہاتھ رکھ دیا۔ جیسے اُس کا دم گھٹنے لگا ہو۔

''نہیں۔'' وہ آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

''نکی باجی میں۔۔ ملٹنٹ بن جاؤں گا...... دنیا چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں...... پاگل ہو گئے ہو کیا...... یہ سب کیا کہہ رہے ہو۔'' نکی تڑپ کر بولی اور اُس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

''تم تنویر خالہ سے...... اگر بات کرو...... تو...... وہ ہم دونوں کو کتنا عزیز رکھتی ہیں۔'' نکی نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔ اور ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''ماماں کو سمجھا سکتی ہیں...... ہیں نا؟''

''...... ہاں...... شاید...... شاید......'' بجھی بجھی آنکھوں میں امید کی قندیل سی روشن ہوئی۔

جس دن نکی کی ماں نکی کی کامیابی کی خوشیاں منا رہی تھی۔ اُس دن نکی پتھر کی طرح خاموش ہو گئی تھی۔

اسی دن یوسف نے تنویر خالہ سے بات کی تھی۔ اور تنویر خالہ کچھ لمحوں تک کچھ بھی نہ بولی تھیں۔ یوسف کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی تھیں کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا۔ مگر اُس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی کہ تنویر بیگم خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگیں۔ لیکن پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکرائیں۔

''وہ تو تمھاری بڑی بہن ہے بیٹا...... مذاق کرتے ہو اپنی چچی سے۔؟ وہ بھی ایک بے جوڑ سی بات کے لیے۔ اُس کی ماں۔ میری زبان سے کہیں ایسا سن لے۔ تو مجھے زندگی بھر معاف نہ کرے۔ جانتے ہو تم ان کا مزاج......'' انھوں نے چولہے پر چڑھی نمک والی چائے سے بھرے تانبے کے گول پیندے والے پتیلے میں ذرا سا جھانکا۔ اور چائے کا رنگ جانچنے کے لیے تانبے کے لمبے دستے والا کفگیر، پتیلے میں گھمانے کے بعد اس میں چائے بھر بھر کر واپس ڈالتی رہیں۔ جالی والے دستے کے اندر پڑی کنکریاں، اوپر نیچے ہونے سے چھن چھن بجنے لگیں۔ کفگیر پتیلی کے کناروں پر ٹکا کر تبسم بیگم ریفریجریٹر کی طرف دودھ لینے کو بڑھیں۔ اس دوران انھوں نے یوسف کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔

''جانتی ہوں میرا بیٹا مجھے ایسے امتحان میں کبھی نہیں ڈالے گا۔'' انھوں نے دودھ کے ساتھ چائے کی پیالیوں میں ڈالنے کے لیے بالائی کی کٹوری نکالی اور یوسف کی طرف نگاہ ڈالی۔

وہ دیوار سے لگا انھیں ہی دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھو میں چائے لا رہی ہوں......'' انھوں نے مسکرا کر کہا۔ اور ملازم کو دستر خوان بچھانے کے لیے آواز لگائی جو گھر کے پچھواڑے باڑی میں پتہ گوبھی کے لمبے پتے توڑ توڑ کر رات کے کھانے میں بننے والے کسی سالن کے لیے بید کی ٹوکری میں جمع کر رہا تھا۔

تنویر بیگم جب ملازم کو آواز لگا کر کھڑکی سے پلٹیں تو دیکھا کہ یوسف جا چکا ہے۔

کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔ اندرونِ شہر، ہر گھر میں چھاپے پڑے تھے۔

خطا وار دھماکے کر کے غائب ہو گئے تھے اور بے گناہوں کو غالباً غلط مخبری کی وجہ سے دھڑ ادھڑ پکڑ کر کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

ہوسٹل سے چھٹیوں میں گھر لوٹے دو بھائیوں کو ان کے والدین کے سامنے دہشت گردی کے الزام میں گولیاں ماردی گئی تھیں۔ غصے یا غلط فہمی یا کسی اور انجانی وجہ سے۔

رہ رہ کر انسانی چیخیں کانوں میں پڑتیں تھیں۔ اُس رات شہر میں شاید ہی کوئی سویا تھا کہ موت کے آنے کے ڈر کے ساتھ ساتھ عزت کے جانے کا خوف بھی تھا۔

تنویر بیگم کے وہاں سے نکل کر یوسف اسی سڑک پر چل رہا تھا جہاں چوراہے کا ایک راستہ جھیل کی طرف جاتا تھا۔ ایک پہاڑی کی طرف۔ ایک شہر کے اندر والے علاقے کی طرف اور ایک نکی کے گھر کی طرف۔

اس سڑک سے گذرتے ہوئے اُس کی رفتار غیر ارادی طور پر دھیمی ہو گئی۔

بے اختیار نگاہیں داہنی جانب ڈھلان کی طرف اُٹھ گئیں۔ بغیر گونجے ایک آواز سماعت تک آ گئی۔

تمھیں موت کے سناٹے میں زندگی کی باتیں کیسے سوجھتی ہیں یوسف۔

آج سے زندگی کی بات نہیں کروں گا نکی باجی......

کاش اُس دن کوئی بندوق تان دیتا...... ہم پر...... کتنی پرسکون...... کتنی حیات بخش موت ہوتی...... میں یوں...... زندگی سے بھاگ...... نہ رہا ہوتا...... مگر اب مجھے بھاگنا چاہیے یہاں سے...... مجھے...... بھاگنا...... چاہیے...... نکی باجی...... میں دور جا رہا ہوں آپ سے...... بہت دور نکی باجی...... بہت دور......

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے...... ڈھلان کے اس طرف کنارے پر اُگی گھاس سوکھ کر بے رنگ ہو گئی تھی۔

وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا طویل سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ راستے میں کہیں کہیں دوکانیں تھیں جو بند ہو رہی تھی۔

ابھی تو اندھیرا ابھی نہیں ہوا...... تو پھر...... دُکانیں کیوں بند......

ہوا کریں۔ اُسے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ اس نے کچھ اور قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ سائرن کی تیز آواز کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا بس یوں ہی بے خیالی میں شاید۔ سڑک ویران تھی اور تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ سائرن کے بعد لاؤڈ سپیکر پر کوئی اعلان ہوا۔ آواز دور سے آ رہی تھی۔ وہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سڑک ایک موڑ پر مڑ گئی۔ کچھ فاصلے سے بکتر بند گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ وہ ویسے ہی چلا جا رہا تھا۔

میں...... جا رہا...... ہوں...... نکی باجی...... میں۔

دفعتاً موڑ پر بائیں جانب کو بستی کے اندر جاتی ہوئی کچی سڑک پر کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر گلی میں کھینچ لیا۔

''کہاں جا رہے ہو...... کرفیو میں...... پاگل ہو گیا......؟'' ایک داڑھی والا نوجوان تھا۔ اُس کے ساتھ تقریباً یوسف کی عمر کا ایک لڑکا تھا جس نے دونوں ہاتھوں میں گیندیں سی تھام رکھی تھیں۔ داڑھی والے نوجوان کے پاس ایک تھیلا تھا۔ جس میں کچھ سامان تھا۔ اُس نے وہ تھیلا اُسی زینے پر رکھا تھا جہاں اُس نے یوسف کو کھینچ کر بٹھا دیا تھا۔ زینہ کسی مکان کے

پچھواڑے سے ملحقہ تھا جو ایک تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ اس سے پہلے کہ یوسف کچھ کہنے کے لیے زبان کھولتا، اس نے دیکھا کہ موڑ کے قریب پہنچنے سے بہت پہلے، اس کا ہم عمر لڑکا گاڑیوں کی طرف دوڑا اور دو گاڑیوں کو اپنی گیندوں کا نشانہ بنا کر ایک اور گلی کی طرف بھاگا...... داڑھی والے نوجوان نے کانوں پر ہاتھ دھر لیے۔ فلک شگاف دھماکہ ہوا۔

''إنا للہ وإنا الیہ راجعون۔'' نوجوان زیرِ لب بولا۔

''کک...... کک...... کیا ہوا؟'' یوسف بری طرح گھبرا گیا تھا۔

''شاہباز شہید ہو گیا...... وطن پر...... قربان ہوا...... دین پر قربان ہوا......''

نوجوان نے بارعب سی آواز میں کہا۔ اور آسماں کی طرف اُڑ رہے سیاہ دبیز دھویں کو دیکھنے لگا۔

''آقا۔'' شاہباز اسی لمحہ گلی میں نمودار ہوا تھا۔

''تم...... تم...... شہید نہیں ہوئے......؟'' وہ تعجب اور تاسف سے بولا۔

''نہیں...... آقا......'' شاہباز نے سر جھکا دیا۔

''کیوں بدنصیب......'' اس نے داہنا ہاتھ ہوا میں اوپر سے نیچے کو لہرایا۔

''باقی کی Convoy بہت دور تھی...... میں کس پر کودتا......'' وہ آہستہ سے بولا۔

''آہ بدبخت...... کیا اسی دن کے لیے ہم نے تمھیں شاہ باز کا خطاب دیا تھا۔ جب تک گاڑیاں سامنے آتیں خود دوڑ کر قریب چلے جاتے...... اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ فدا ہونے کے لیے دستی بم ایسے بااثر نہ ہوں گے۔ دوسرے ہوتے تو ہم خود ریموٹ سے کنٹرول کرتے...... اور اب تک تم جنت میں ہوتے اور ان کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔ تمہارے بعد جب تمہارے والدین انتقال کرتے تو وہ بھی جنت میں جاتے۔ کم سے کم اتنا تو سوچتے۔ وہیں ڈٹ جاتے گاڑیاں تو آہی جاتیں۔ دیکھو اس کے بعد کانوائی نے رخ موڑ دیا۔'' نوجوان نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''اگر کوئی شہید ہوتا ہے تو کیا اس کے والدین جنت میں جاتے ہیں؟'' یوسف نے نوجوان کو

خاموش ہوتے دیکھ کر فوراً سوال کیا۔

''ہاں...... بالکل...... ایسا ہی ہوتا ہے......'' نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''مگر میں نے تو ایسا کہیں نہیں پڑھا۔ حافظ کی ماں جنت میں جاتی ہے۔ وہ بھی اگر اُس نے خود اپنی اولاد کو حفظِ کلام اللہ کرایا ہو...... ورنہ میں نے کسی حدیث میں یہ نہیں پڑھا کہ......'' یوسف نے تجسّس سے کہا۔

''نادان ہو تم...... جہاد کے راستے میں......'' وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر خاصی گھمبیر آواز میں کچھ کہتے کہتے رُکا۔

''یہاں کریک ڈاؤن ہوگا۔ بھاگو۔ جلدی......'' اُس کی آواز دفعتاً خوف سے بھر گئی۔ شاہباز پھرن کے اندر پہنی ہوئی واسکٹ کی جیبوں میں بھرے بم نکال نکال کر زینے پر رکھے تھیلے میں ڈال رہا تھا۔

''رہنے دو...... بعد میں نکال لینا...... پکڑے جائیں گے ورنہ......'' نوجوان جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''راستے میں...... کہیں پھٹ گیا آقا...... تو؟''

''تم اتنے خوش نصیب کہاں ہو......'' نوجوان نے اُسے نظر بھر کر دیکھا۔

''آقا میرا...... میرا مطلب تھا اگر غلط جگہ کہیں پھٹ گیا...... تو...... تو...... خدانخواستہ آپ کو...... کہیں آپ۔'' وہ ہکلایا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو...... تھیلا میں سنبھال لوں۔'' یوسف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

نوجوان مسکرا دیا۔

''مبارک۔ صد مبارک۔'' اُس نے یوسف کو بغور دیکھا اور گلی کے اندر مڑ گیا۔

کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔

وادی کے حالات ابتر ہوتے گئے۔ کس نے اس سکون پر شب خوں مارا۔ کوئی اپنے گھر میں تو ایسا نہیں کرتا۔ کوئی باہر کا ہوگا۔ مگر باہر کے بھی سب لوگ تو ایسی سوچ نہیں رکھ سکتے۔ کچھ منفی سوچ والے افراد نادانی، غرور اور غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں گے کہ صدیوں سے ایسا ہوتا آیا ہے اور کبھی بھی، کہیں بھی ہو سکتا ہے۔

اس خطے کے ساتھ سولہویں صدی سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ چندر گپت موریہ اور پھر اشوک کے مہان ہندوستان کو افغانستان اور نیپال کی آخری سرحدوں تک وسیع کرنے والی عظیم الشان سلطنتِ مغلیہ کے شہنشاہوں نے بھی ایسا ہی کیا، جب شاعرۂ معروف و مقبول اور ہر دل عزیز ملکۂ کشمیر زون، یعنی چودھویں کا چاند ملقّب حبّہ خاتون کے شاعر بادشاہ یوسف شاہِ چک کو اکبر اعظم نے دھوکے سے قید کر لیا تھا۔ شاہ غریب الوطنی میں اپنی ملکہ سے دور انتقال کر گیا۔ وطن کی مٹی بھی اسے نصیب نہ ہوئی......اور ملکہ روتے روتے دیوانی ہو گئی۔ ہجر کے نغموں سے بیاضیں سیاہ کر دیں۔ اور آخر کار اپنے یوسف کو پکارتے پکارتے حبّہ خاتون نے بھی اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ وادی میں اُس کے نغمے گونجتے رہے۔

'نادلائے، میانہِ یُوسُفو ولوٗ۔

(پکارتی ہوں میں تجھ کو مرے یوسف آ جا)

اور گونجتے رہیں گے۔

پھر افغانستان سے افغان آئے۔

شامتِ اعمال سے افغان حاکم ہو گئے
آئے وہ اور طالع بیدار اپنے سو گئے

کسی شاعر نے احتجاجاً شعر کہا تھا۔ پھر پنجاب سے سکھ، کیا کیا ٹیکس لگائے گئے تھے۔ اُن کے دور میں۔ اور پھر سات سمندر پار سے انگریزوں نے آ کر وادی جموں کے ڈوگروں کو فروخت کر دی۔ ایک 'native' کو دوسرے 'native' کا آقا بنا دیا۔ وہ بھی ایک تکلیف دہ دور تھا۔

کشمیریوں کو تو مطلق العنان مہاراجہ سے آزادی چاہئے تھی...... سب نے جی بھر کے ظلم ڈھائے......

نکی نے کتابوں میں یہ سب پڑھا تھا۔

کشمیری...... محکوم ہی رہے...... صدیوں......

اب کہیں آدھی صدی بھر پہلے جمہوریت آئی...... تو...... کچھ سکون کے بعد پھر یہ بے سکون شب و روز۔ کیوں ہو رہا ہے یہ سب۔ کیوں......

جانے کیوں آج اُسے بالکل ہی نیند نہیں آرہی تھی۔ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی وہ آج۔ کبھی کبھی اچانک گھبرا اٹھتی تھی۔ نہیں اچانک نہیں۔ جب کہیں سے کسی دھماکے کی آواز آتی۔ اور آواز تھی کہ بار بار آجاتی۔

ادھر رات تھی کہ طویل ہوئی جاتی تھی۔ اگر صبح ہو جاتی تو وہ تنویر خالہ کے وہاں فون کر کے خیریت معلوم کرتی ان کی...... سب کی...... سب کی خیریت۔ اسے رہ رہ کر جانے کیسی محرومی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سے خالی پن کا۔ ایک جان لیوا سی فکر کا۔ کون سی فکر تھی یہ۔ اُسے ٹھیک سے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ یاور سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ یا شاید...... اگر یوسف سے کوئی بات...... کوئی بات ہو پاتی...... اگر...... یاور سے بھی کوئی رابطہ نہ ہوا تھا کل سے...... شاید یوسف نے تنویر خالہ سے کوئی بات کی ہو۔ کوئی پر امید بات ہوتی تو اب تک......

صبح تنویر بیگم کو معلوم ہوا کہ یوسف کل رات اپنے گھر نہیں گیا تو اُن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُنہوں نے دو ایک جگہ اور فون کرنے کے بعد نکی کے یہاں فون کیا تھا کہ شاید کسی کو معلوم ہو...... تو نکی کا سر زور سے چکرایا تھا......

چلا جاؤں گا نکی باجی...... دور چلا جاؤں گا...... اتنا دور ہو جاؤں گا کہ...... آپ...... یوسف نے دبی دبی ہچکی لی تھی۔

نکی بے ہوش ہو چکی تھی۔

کئی روز ہو گئے تھے۔ یوسف کی کوئی خبر نہ تھی۔ اُس کے والد کو دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اُس کی فربہ اندام ماں کا وزن آدھا ہو گیا تھا۔ اور اس کی تنویر چچی اپنی بھابی سے نظر نہ ملاتی تھی۔ اور یوسف کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی۔

نکی پتھر کی مورت سی طبی کالج جایا کرتی۔

جب دن مہینوں میں بدلے اور تین مہینے ہو گئے تب ایک دن یاور کو اپنے سکول کے باہر یوسف کھڑا نظر آیا۔ وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ گیا۔

''کہاں چلے گئے تھے یوسف بھائی......'' وہ رو پڑا۔ یوسف کی آنکھیں بھر آئیں۔

''کیوں چلے گئے تھے یوسف بھائی......اب تو نہیں جائیں گے نا۔ سب کو دُکھی کر دیا آپ نے......ہم سب مر جائیں گے آپ کے بغیر۔ مت جائے گا اب کبھی بھی۔''

وہ یوسف کی درمیانی پسلی تک آتا تھا۔ اس کے سینے کے ساتھ سر ٹکائے کمر میں باہیں ڈالے بولتا رہا۔ اور یوسف جو اُسے جانے کیا کیا کہنے آیا تھا، ایک ہاتھ سے اُسے لپٹائے اور دوسرے سے اس کا سر سہلاتا رہا۔

''میں گھر سے ہی آ رہا ہوں۔ صبح آیا تھا......سب خیریت ہے نا......اُدھر۔''

''ہاں......اُدھر......بڑی خالہ کے وہاں نا؟'' اُس نے یوسف کی آنکھوں سے مشابہہ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُٹھا کر اُسے دیکھا، تو یوسف نے اثبات میں سر ہلایا۔

''نکی باجی بالکل ادھ موئی سی ہو گئی ہیں۔ ان کا Face پیلا ہو گیا ہے......وہ تو کسی سے بات ہی نہیں کرتیں اب تو......''

مسہری پر اوندھی، اپنی بیاض پر جھکی نکی کو خبر ہی نہ ہوئی کہ کب یاور آ کر اُس کے پلنگ کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔

رستہ بھول گئیں خوشیاں ڈھونڈوں جا کر کس رستے

یاور نے ایک صفحے پر نظر ڈالی۔ بے چاری نکی باجی......

تیری دو آنکھوں کی راحت جو گئی

زندگی میری مصیبت ہوگئی

''نکی باجی......''

نیلی نیلی دو آنکھیں پلنگ کے بان پر ناک ٹکائے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

''کیسی ہیں نکی باجی؟'' یاور نے چہرہ اوپر کیا۔

پل بھر کو نکی کا دل جیسے حلق میں اُچھل آیا تھا۔ سال بھر پہلے تک یوسف ایسا ہی لگا کرتا تھا۔ اُس نے گلے کے قریب ہاتھ رکھ کر گویا زخمی طائر سے پھڑکتے دل کو سنبھالا۔

''کیسا ہے میرا پیارا سا چھوٹا سا دوست۔ میرا بھیا؟'' اُس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور یاور کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

''بہت خوش ہوں نکی باجی...... میں......'' خوشی اُس کی معصوم سی آواز سے چھلکی پڑتی تھی۔ نکی بیقرار آنکھوں سے اس کے چہرے کے تاثرات میں اپنے سوالات کا جواب مانگنے لگی تو اُس نے کتابوں کے بیگ میں رکھے پینسل باکس میں سے ایک پرچی نکال کر نکی کے حوالے کی۔

وہ دونوں پہاڑی کے دامن میں کئی بارہ دریوں پر مشتمل باغ کے بالائی باغیچے کے کونے میں بیٹھے تھے۔ صدیوں پہلے مغل شہزادے دارا شکوہ نے ستاروں کی گردش جاننے کے لیے جھیل ڈل کے کنارے کوہِ زَبرون پر یہ مشاہدہ گاہ بنوائی تھی کہ اُسے علم نجوم سے خاصا شغف تھا۔ باغ کا نام پری محل رکھا گیا تھا۔

بے شمار پھولوں سے سجے ان باغیچوں سے جھیل کا منظر نہایت دل فریب معلوم ہوتا تھا۔ جھیل کے کنارے واقع مغل باغات کی سیر کرنے والوں کی تعداد شام کو بڑھ جایا کرتی تھی، لیکن ادھر اب ایسا شاذ و نادر ہی ہوا کرتا۔ نیچے کنارے پر رنگ برنگی چھوٹی کشتیوں کی قطاریں سونی تھیں۔ یہ کشتیاں شکارے کہلاتی تھیں اور وادی کے اچھے دنوں میں سیاحت کی مصروف ترین آماجگاہ ہوتیں۔ بڑے بڑے گل بوٹوں والی نشست گاہوں اور خوش رنگ ریشمی پردوں والی ان کشتیوں کو کنارے باندھ، ناخدا جانے کہاں چلے گئے تھے۔ حالانکہ بہار شباب پر تھی۔ دور بیچ جھیل کے ایک چھوٹی سی بغیر چھت کی کشتی جس کی لکڑی کا سارا رنگ پانی نے پی لیا تھا، دوسرے کنارے کی طرف آہستہ خرامی سے رواں تھی۔

''کہاں تھے...... تم؟'' نکی نے اسے کئی لمحوں تک بغور دیکھا۔ وہ ایک دم بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ اُس نے داڑھی بڑھا رکھی تھی۔ گھٹنوں سے نیچے تک لمبے کرتے کے اوپری کھلے بٹن میں سے سینے میں اُگے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور گھنگھریالے بال پہلے کی ہی طرح داہنے ابرو تک آتے تھے، جن کے پیچھے نیلی نیلی آنکھیں جیسے دو جہاں کی فکر میں غلطاں تھیں۔

''تم میرے ساتھ چلو گی عتیقہ......؟'' یوسف کی آنکھیں یکایک جیسے باغی ہو گئیں تھیں۔ اُس کے طرزِ تخاطب پر نکی چونکی نہیں تھی۔

''کہاں......؟'' چھوٹے سے پھاٹک کے قریب لگے سونف کے پودے ہوا کے جھونکے سے لہرائے۔ ایک دلربا سی مہک پھیل گئی۔

''یہ ہی ایک راستہ ہے...... ورنہ...... کوئی آپ کو کیوں مجھے سونپے گا...... ہاں نہیں کریں گی نکی باجی تو...... تو خدا کی قسم...... خدا کی قسم......''

وہ پل بھر میں پہلے کی طرح اداس اور مجبور سا ہو گیا۔ آنسو بھر آئے۔

''نہیں یوسف...... نہیں......'' اس کی ایک آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ نکی اُسے دیکھتی رہی۔

''ایسا مت کرو...... ایسا نہ کہو...... یہ کیسے ممکن ہوگا...... یہ کیونکر ہوگا......؟''

''کیوں نہیں ہوگا نکی باجی......'' اُس نے نکی کا ہاتھ پکڑ کر چھوڑ دیا۔

لمبی سفید دم والی ایک سیاہ چڑیا سامنے زرد گلابوں کی کیاری پر آ بیٹھی اور منقار آسمان کی جانب اٹھا کر زور سے چہچہائی۔ یوسف نے نظر دوڑا کر چڑیا کی طرف دیکھا۔ نکی نے بھی چونک کر اُدھر دیکھا تھا۔ دونوں مسکرا دیئے۔

''ہم ایسے ہی ہمیشہ ساتھ ہنس سکتے ہیں نکی باجی...... مان جایئے نا...... میں آپ کی تعلیم ضایع نہیں ہونے دوں گا۔ خود بھی کوئی اچھا کام کروں گا...... اب بھی وقت ہے نکی باجی...... میرے دوستوں نے سب انتظام کر رکھا ہے...... ہم نکاح کر لیں گے۔ پھر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا...... ورنہ بعد میں کبھی ایسا موقع نہیں آئے گا...... ابھی بھی ہاں کر دیجئے نکی باجی......''

نکی اپنے گھٹنوں کو باہوں کے حلقے میں لیے بیٹھی اپنے پاؤں دیکھتی رہی۔

''میں تمھیں دنیا کی ہر خوشی دوں گا۔ اپنا سب کچھ تمہارے قدموں میں رکھ دوں گا...... ہمارا چھوٹا سا...... گھر ہوگا...... تم ہمیشہ مسکراتی رہوگی...... کوئی تمہاری ماں کی طرح تم پر بندشیں نہیں ڈالے گا......''

وہ خاموش ہوگیا۔ اور سر جھکا کر نکی کے پیروں کو دیکھتا رہا۔ پرندے چہچہاتے رہے۔ سونف کی خوشبو ہواؤں میں گھلتی رہی۔ نکی چپکے چپکے روتی رہی۔ دو ایک آنسو اُس کے پاؤں پر گرے۔ یوسف نے انھیں ہاتھ سے پونچھ لیا۔

''کیا ہوا...... نکی باجی......'' وہ تھکی ہوئی سی آواز میں بولا۔

''میں...... جانتا تھا...... آپ میرا ساتھ...... میرا ساتھ...... نہیں دیں گی......'' اُس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ آواز کی لرزش قابو میں رکھ کر بولتا ہوا موٹر سائیکل تک آ گیا۔

سامنے جھیل میں سورج نے غوطہ لگایا اور ڈوب گیا۔ آسمان کا وہ کنارہ اُس وقت تک دہکتے

انگارے سا سرخ رہا جب تک موٹر سائیکل نیچے سڑک کے موڑ تک آ گئی کہ یوسف سامنے دیکھ رہا تھا اور نکی کی نظروں کے سامنے سڑک ختم ہونے تک آسمان ویسا ہی سلگتا سلگتا سا رہا۔
کبھی کبھی منظر دھندلا جاتا مگر آنسو ٹپک جاتے تو سب صاف نظر آنے لگتا۔
نکی کے گھر کو مڑنے والی گلی کے موڑ پر یوسف نے لبِ سڑک موٹر سائیکل روک دی اور دونوں پاؤں زمین پر ٹکائے موٹر سائیکل پر ہی بیٹھا رہا۔
''آنکھوں سے......اوجھل مت ہونا...... یوسف......'' نکی کی آواز کانپتی رہی۔ ہچکیاں گھٹتی رہیں۔
''اپنے فیصلے پر آپ تمام عمر پچھتائیں گی نکی باجی۔'' اس کی آنکھوں میں موت کی سی سرد مہری تھی۔ اُس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی۔ نکی نے ہنڈل پکڑے ہوئے اُس کے ہاتھ پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کی آنکھوں کو خوفزدہ سی نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھوں کی گرفت اُس کے ہاتھ پر مضبوط کر دی۔
''ایسا مت کرنا۔''
وہ سراپا التجا بن گئی۔
یوسف اسے کچھ لمحوں تک چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک رنجیدہ سی مسکراہٹ پھیل گئی......اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی۔ نکی موڑ پر پتھر کی مورت سی کھڑی اُسے دور ہوتا دیکھتی رہی۔
'پکارتی ہوں میں تجھ کو مرے یوسف آ جا'
رخساروں پر دو تازہ آنسو ڈھلک آئے۔ دو آنکھیں سڑک کے موڑ پر رکھ کر وہ گھر کی جانب مڑ گئی۔

اُن دنوں حالات اور بکھر گئے تھے۔ وادی اور اُداس ہو گئی تھی۔ گھروں میں افراد کم ہو گئے

تھے۔ دل رنجیدہ رہا کرتے تھے۔ گھروں سے کام کی خاطر نکلنے والوں کے شام کو لوٹنے تک گھر میں رہنے والے وسوسوں میں گھرے رہتے۔

سال بھر ہونے کو آیا تھا۔ یوسف کی کوئی خبر نہ تھی۔ اُس کی ماں کا دل کبھی اداس ہو جاتا اور کبھی پُر اُمید۔ یہ دل اُسے دن میں کئی کئی بار مارتا اور زندہ کرتا تھا۔

اُس کے باپ کو دل کا دوسرا دورہ پڑ چکا تھا۔

جس دن پڑوس کے کسی لڑکے کی پہچان کے ایک آدمی نے بتایا کہ یوسف زندہ ہے مگر دور سرحد کے اُس پار...... اُس دن اُس کی ماں سارا دن صرف روتی رہی تھی۔

'میرا بیٹا زندہ ہے...... مگر موت کی ٹریننگ لے رہا ہے۔'

جانے کتنی دفع اُس نے یہ جملہ اپنے آپ سے دہرایا تھا۔ مگر دل کے مریض شوہر کے سامنے صرف آہیں بھر کر رہ جاتی۔

'ہم سے دور ہی سہی...... زندہ تو ہے...... کبھی نہ کبھی لوٹ آئے گا ہمارے پاس...... آخر ہمارا بچّہ ہے...... ہمارا خون ہے......'' وہ شوہر کو تسلی دیا کرتی۔

خزاں کی آمد نے چناروں میں آگ لگا رکھی تھی۔

نکی کے گھر کے پچھواڑے باہری دیوار کے اُس پار کنجڑوں کی کھیتیاں تھیں جن میں کئی طرح کی سبزیاں لہلہایا کرتی تھیں، مگر ان دنوں وہاں صرف کرم کا لمبی ڈنڈیوں والا ساگ اُگا ہوا تھا جس کے بڑے بڑے پتّے چنار کے درخت کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے اکتوبر کے چاند کی بھیگی ہوئی چاندنی میں نکھرے نکھرے سے نظر آ رہے تھے۔

چاندنی کو اپنی مسہری کے کنارے تک آتا دیکھ نکی اُٹھ کر کھڑکی تک چلی آئی۔ کچھ لمحے وہاں کھڑی رہ کر واپس بستر پر لیٹ گئی۔ وہ آج بھی سو نہیں پا رہی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ وہ تاریکیمیں آنکھیں کھولے چھت کو ٹکٹکی باندھ دیکھتی رہی۔ آنسو اُس کے کانوں میں جمع

ہوتے رہے۔اس کی اکثر راتیں آدھی سے بھی زیادہ بے خواب گزر جاتیں۔

پاس کی تپائی پر پڑے فون کی گھنٹی بجی۔لمبی دوری سے بجنے والی لمبی گھنٹی۔نکی نے لپک کر ریسور اٹھایا کہ گھر میں کسی کی نیند نہ خراب ہو۔

کون ہوگا اتنی رات گئے......

''نکی باجی......''اس کی باریک سی ہیلو کے جواب میں آواز آئی۔دل سینے میں ایسے دھڑکا جیسے مردہ بدن میں کسی نے اُسی لمحے روح پھونک دی ہو......اُس کا ہاتھ بے اختیار حلق پر چلا گیا۔

''یوسف......''اس کی آواز کانپی۔''کہاں ہو یوسف؟''وہ رو پڑی۔

''مجھے جیتے جی مار کر تم......تم کہاں چھپ گئے یوسف......کب آؤ گے......کہاں سے بول......''وہ ہچکیاں لینے لگی۔

''میں مرا نہیں نکی باجی......زخمی ہو کر نامراد پڑا رہا......مرنا چاہتا ہوں......اس وقت سمندر پار ہوں......''

''تم آجاؤ یوسف......میں بھی نیم مردہ ہوں......ساتھ مریں گے دونوں۔''

''میرا وہاں آنا......ناممکن ہے......میرے پاس پاسپورٹ کہاں ہے وہاں کا۔جہاں کے پاسپورٹ سے یہاں آیا ہوں......وہ بھی مجھے کہاں چھوڑیں گے......''

''کیوں کیا تم نے ایسا یوسف......تم مجھے کس قصور کی سزا دے رہے ہو......اپنے والدین کو کیوں دُکھ دے رہے ہو......لوٹ آؤ یوسف......''

''نہیں نکی باجی......برف باری کے وقت آنے میں پکڑا نہ گیا تو روپوش تو رہنا پڑے گا......سب کی زندگی خطرے میں کیسے ڈال دوں......یہ ممکن ہی نہیں ہوگا۔''

''آ کر Surrender کر لو یوسف......یہ غلط راستہ کیوں کر چن لیا تم......''

''چپ......یہ لفظ دوبارہ کبھی مت دہرایئے گا......یہیں پر ختم کر دیا جاؤں گا......شہادت کا موقع نہیں ملے گا مجھے......آپ نہیں جانتیں......''

''یہ کوئی شہادت ہے یوسف...... تم تو اتنے ذہین تھے...... اتنے سمجھدار تھے...... یہ تمھیں کیا ہو گیا...... ہے...... تم......''

''بس کیجئے نکی باجی...... ہمیشہ آپ مجھے اپنےStudent کی طرح اپنی مرضی کی باتیں سمجھاتی آرہی ہیں...... اب میں......''

''میری مرضی...... میری...... مرضی...... میری کون سی مرضی رہی ہے...... کیسی مرضی......''

آنکھوں میں نئے نئے آنسو بھر آنے سے اُس کی ناک بندسی ہوگئی تو آواز بھیگ گئی۔

''sorry نکی باجی...... دل نہیں دُکھانا چاہتا تھا آپ کا...... معاف کر دیجئے مجھے...... معاف کر دیجئے......''اُس کی آواز بھی رندھ گئی۔ اور فون بند ہو گیا۔

نکی نے فون کان سے ہٹا کر رخسار سے لگا لیا۔

کتنے عرصے کے بعد اس نے یوسف کی آواز سنی تھی۔

فون رکھ کر وہ کھڑکی کے قریب آ گئی چوکھٹ پر ہاتھ دھر کر چاند کو دیکھتی رہی اور پھر کہیں کہیں دور دور نظر آتے تاروں کو۔

شاید فون کٹ گیا ہو...... اور پھر گھنٹی بج جائے...... اس انتظار میں وہ رات بھر نہیں سوئی۔ سحر تک بھی نہیں۔

کچھ مہینے اور گذر گئے۔ نکی اُس کے فون کا انتظار کرتی رہی۔ گھر کے راستے میں آنے والے قبرستان میں نرگس کے پودے کئی بار زمیں سے اونچے ہوئے، پھولے اور مرجھائے۔ فون نہیں آیا۔ راتوں کو برہا کے گیت لکھ لکھ کر اُس نے بیاضیں بھر دیں۔

ہر روز کالج سے لوٹتے وقت قبرستان کے قریب سے گذرتے ہوئے اُس کی رفتار سست ہو جایا کرتی۔ نظریں اس طرف اٹھ جاتیں۔

ایک دن اُس نے دیکھا کہ قبرستان کی دیوار کے چھوٹے سے دروازے کی جگہ بڑا سا پھاٹک

لگایا گیا ہے۔

'اناللہ وانا الیہ راجعون'۔

پھاٹک کی ہری محراب پر سیاہ رنگ کی عبارت نے اس کی نظریں جکڑ لیں۔ کچھ لمحے وہ عبارت کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس کے قدم پھاٹک کے درمیان لگے چھوٹے سے کواڑ کی طرف اُٹھ گئے۔ وہ ڈھلان اُتر کر منڈیر سے جا لگی۔ سامنے دور تک پھیلے ہوئے قبرستان میں بے شمار قبروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جگہ جگہ نئے کتبے کھڑے تھے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی اور آنکھیں زور سے بھینچ لیں۔

اگر اس وقت...... کوئی ہم پر بندوق تان دے...... تو کیا ہمیں بھاگنا چاہیے نکی باجی......

کسی نے دھیرے سے کہا۔

بند آنکھوں سے نکل کر آنسو نکی کے رخساروں پر پھسل گئے۔

نہیں...... نہیں یوسف...... تم مجھ سے دور بھاگ گئے...... میں...... میں کہاں بھاگ سکتی ہوں...... میں کہاں جا سکتی ہو...... میں کہاں جاؤں...... یوسف......

نکی چپکے چپکے سسکنے لگی۔ خوب رو لینے کے بعد جب جی کچھ ہلکا ہوا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ نرگس کے پھولوں میں ایستادہ کتبوں پر نام اور تاریخِ پیدائش کے ساتھ تاریخِ انتقال درج تھے۔

نصیر احمد ملک	:	تاریخِ پیدائش	:	۹/ستمبر ۱۹۷۰ء
		وفات	:	۶/فروری ۱۹۹۲ء
محمد راشد میر	:	تاریخ پیدائش	:	۵/جون ۱۹۷۲ء
		وفات	:	یکم جولائی ۱۹۹۳ء

وہ دہشت زدہ سی منڈیر سے لگی بیٹھی دُور دیوار تک پھیلے کتبے پڑھتی رہی۔ اُس کے چہرے پر کرب اُتر آیا۔ ہونٹ دانتوں میں بھینچے سسکیاں لیتے ہوئے اُس نے منھ دوسری جانب

موڑا تو ایک بالکل تازہ تربت پر سیاہ سنگ مرمر سے تراشی لوحِ مزار نئی بہار کی نکھری ہوئی ٹھنڈی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ قبرستان کے کناروں پر لگے بید کے درخت اُس پر بار بار سایہ کیے دیتے تھے۔

یوسف احمد خان پیدائش : ۱۱؍مارچ ۱۹۷۳ء

وفات : ۲؍جون ۱۹۹۳ء

''نہیں......'' اُس کا ہاتھ بے اختیار اُس کے ہونٹوں پر چلا گیا۔ دوسرا ہاتھ اُس نے اپنے حلق پر رکھ دیا...... دبی دبی سی چیخ اُس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئی۔ ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گلے کو اُس نے انگلیوں سے ایسے تھام رکھا تھا جیسے اُس کی جان اُسی راستے نکل بھاگنے والی ہو۔

یہ نہیں ہوگا...... میرے ساتھ...... میرے اللہ...... یہ نہیں ہوگا...... اُس نے تڑپ کر آسمان کی جانب نگاہیں اٹھائیں اور سر پیچھے منڈیر پر اُگی ہری ہری نم گھاس سے ٹکا دیا۔ نیلا نیلا آسمان بے داغ نظر آ رہا تھا۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر چہرہ بھگوتے رہے۔ دیوار سے ملحقہ مسجد میں بجلی نہ ہونے کے باعث بغیر لاؤڈ سپیکر کی پر درد سی اذان گونجا کی۔

بید کی ٹہنیوں میں لوٹ آنے والی چڑیوں نے جب چہک چہک کر آسمان سر پر اٹھا لیا تو نکی نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں پر دوپٹہ رکھ کر تھکے ہوئے پپوٹوں سے لگے آنسو جذب کر لیے۔ اور کھڑا ہونے سے پہلے ایک نظر پھر بائیں جانب دیکھا۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ اس کے گلے کے قریب چلا گیا۔

وہاں کوئی تازہ قبر تھی نہ کتبہ۔

اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور اُسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

پھر...... مہینے سالوں میں بدلنے لگے ایک دن کسی نے یوسف کی والدہ کو فون کر کے بتایا کہ

آج شب کے ایک بجے یوسف اُن سے ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ رابطہ قائم کرے گا۔
''ہمارا بیٹا زندہ ہے سلامت ہے......'' اُس کی ماں نے یہ خوش خبری گھر میں سب کو فرداً فرداً سنائی۔ اُس دن وہ سارا وقت لوریاں گاتی رہی، اور رہ رہ کر اُس کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔
کمپیوٹر کے مانیٹر پر اُس کے بیٹے کی تصویر اُبھری تو وہ پہچان ہی نہ پائی۔ اُس نے سر منڈوا رکھا تھا۔ داڑھی گریبان تک بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں نیم وا سی تھیں اور جب اُس نے والدین کو مخاطب کیا تو اُس کی آواز بھی تھکی تھکی سی معلوم ہوتی تھی۔
''آجاؤ...... چاند...... گھر آجاؤ......'' ماں نے مانیٹر پر نظر آرہے اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور رو پڑی۔
''تمہاری ماں...... مرجائے گی بیٹا......'' باپ کی آواز کانپ رہی تھی۔
''ابوّامّی بیمار ہیں یوسف...... تمہارے بغیر گھر بالکل تباہ ہو گیا ہے...... تمہارے بغیر کسی کا جی نہیں لگتا......'' بہن سسکیاں لینے لگی۔
''اس طرح کی باتوں سے میرا ایمان کمزور کرنے کی کوشش نہ کریں آپ لوگ...... بس دعا کریں کہ میں جام شہادت نوش کروں...... اور آپ سب کے لیے جنت کے دروازے وا کروں......''
اُس کی آواز میں عزم جھلک رہا تھا مگر چہرے پر غم کے سائے سے لہرا جاتے۔
''کسی طرح کچھ دن کے لیے آجاؤ...... یہ سب صحیح نہیں میرے لعل...... میں تمھیں سمجھا دوں گی۔ کچھ دن کے لیے آجاؤ...... تمھیں سینے سے لگانے کے لیے میرا...... میرا کلیجہ پھٹا جارہا ہے......'' ماں روتی رہی۔
''میرے جنازے کو کندھا دینے ہی آجا...... میرے بچے......'' باپ بے بسی سے بولا۔
''اب جنّت میں ملاقات ہونے کی دعا مانگیے ابوّ...... امّی بزدلوں والی باتیں مت کیجیے......''

یوسف کی آواز میں یاسیت شامل ہوگئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو...... کس نے بھٹکا دیا تم کو...... میرے بیٹے...... ہمارے پاس کبھی جی بھر کے بیٹھتے...... بات کرتے ہمارے ساتھ...... تو ہم تمھیں سمجھاتے تو۔''

''اُف ابو...... پھر وہی نصیحتیں...... پھر آپ...... میری بات کبھی سمجھیں گے۔ کبھی آپ ابو...... کبھی نہیں...... اچھا کچھ دن بعد پھر Contact کروں گا میں......'' اُس کے چہرے پر کرب اُتر آیا تھا۔ مانیٹر کا Screen کورا ہوگیا۔

کاش وہ ایک جھلک دیکھ پاتی۔ یاور سے ویڈیو کانفرنسنگ کی بات سن کر نکی کے دل میں حسرت جا گی اور سوگئی۔

کچھ دن بعد یہ بات بھی پرانی ہوگئی اور ہوتی چلی گئی۔ یوسف کی کوئی خبر نہ آئی۔ ایک برس اور بیت گیا۔

یاور نے آ کر نکی کو بتایا کہ یوسف کے والد اب زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ اور کچھ بہتر ہوتے ہی یوسف کی ماں انھیں حج پر لے جائے گی۔

یوسف کے والدین فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد کسی دوسرے شہر چلے گئے اور کوئی دو ماہ بعد لوٹے۔

انھیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ برسوں کی عمر جی کر لوٹے ہوں۔ نہایت ضعیف اور...... بیمار...... اور دوسرے ہی دن، دل کا تیسرا دورہ پڑنے سے یوسف کے والد انتقال کر گئے۔

یوسف کی ماں کے آنسو نہیں بہے تھے۔

وہ اب اکثر اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔

اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہوگیا تھا۔

اب وہ ٹیلیفون کی گھنٹی پر چونکتی بھی نہیں تھی۔

بہت پہلے جب یوسف زخمی ہوا تھا تو اُس کی ناک سے کئی دن خون بہتا رہا تھا۔ وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کسی دھماکے کے دوران کہیں سے کوئی چیز اُس کے ابرو پر آ لگی تھی۔ جب سے ہی اُس کے سر میں شدید درد رہتا تھا۔ ساتھی اُس کے سر پر کس کے گمچھا باندھ دیتے۔ درد دور کرنے کی گولیاں بے شمار کھانا پڑتیں۔ پہلے پہل درد اٹھنے کے درمیانی وقفے طویل ہوا کرتے جو رفتہ رفتہ مختصر ہونے لگے اور اب یہ عالم تھا کہ آدھ پون گھنٹے کے وقفے سے درد اٹھتا اور چھ، آٹھ گھنٹے رہا کرتا۔

حج کے دوران یوسف نے اپنے والدین سے رابطہ قائم کیا تھا۔

دوسرے شہر میں ملاقات طے ہوئی۔ اور برسوں بعد انھوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا جو بیحد کمزور لگ رہا تھا۔ مگر والدین کو دیکھ کر مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔

دوسرے دن سمندر کے اوپر بہت سے بادل ادھر سے اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ جیسے بادلوں کا پہاڑ راستہ بھٹک گیا ہو۔ جزیرے پر تعمیر ہوٹل کی کثیر منزلہ عمارت کے کسی اوپری سویٹ کی بالکنی میں وہ تینوں بیٹھے تھے۔ یوسف کو ہفتے بھر بعد ٹھکانے پر لوٹ جانا تھا۔ والدین کا ویزا بھی ختم ہونے والا تھا۔

اُس دن یوسف کے والد بے حد پر سکون لگ رہے تھے۔ ان کی نظریں بیٹے کے چہرے سے ہٹتی نہیں تھیں۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ بیٹا اُن کی بات مان لے گا اور وہ اُسے واپس لے آنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے کیونکہ اس نے ماں باپ کی کسی بات کے جواب میں کوئی ضد نہیں کی تھی۔ خاموش سنتا رہا تھا۔

یہ باتیں یوسف کی بہن نے یاور کو بتائیں تھیں...... مگر بہت دن بعد۔

جب خود اُسے اُس کی ماں نے بتایا تھا......

بہت دن بعد۔ جب اُس کی ماں کے سپاٹ چہرے پر کچھ تاثرات ابھرنے لگے تھے......
بہت دن بعد۔ جب اُس کی ماں رونے اور بات کرنے لگی تھی۔

اُس دن ماں کی گود میں سر رکھے بادلوں کو دیکھتے ہوئے اُس کے سر میں درد اُٹھا تھا۔ جو کسی طرح کم ہونے میں نہ آیا اور پہلے سے کہیں زیادہ شدید ہوتا چلا گیا۔
ایکسرے سے نظر آیا کہ اُس کے دماغ کی باہری جانب کے سیّال مادے میں بائیں آنکھ کے بالکل سیدھ میں کوئی انچ بھر لمبی اور آدھا انچ نصف قطر کی کوئی چیز پڑی ہے۔ M.R.I سے پتہ چلا کہ وہ ایک گولی ہے جو بہت پہلے آنکھ کے اندرونی کونے سے گھس کر نہ جانے کس طرح بغیر آنکھ کی پتلی سے لگے، سر میں بیٹھ گئی تھی۔ اب سرجری کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔
آپریشن کر کے گولی نکال دی گئی...... مگر یوسف کو ہوش نہ آیا۔
کچھ دن 'کوما' میں رہ کر یوسف موت سے ہم آغوش ہو گیا۔
دیارِ غیر میں اُسے سپردِ خاک کر کے اُس کے والدین لوٹ آئے تھے۔

نکی کے گھر کے راستے میں پڑنے والے قبرستان میں کسی نئی میت کے لیے اب کوئی جگہ نہیں بچی ہے۔ اُس کی دیواریں خستہ ہو کر کئی جگہ سے ٹوٹ گئی ہیں...... یہاں تک کہ بہار کی آمد پر سڑک پر چلتے وقت بغیر منڈیر تک جائے۔ نرگس کے پھول آسانی سے نظر آجاتے ہیں...... وہاں سے گذرتے وقت نکی کی رفتار خود بخود دھیمی پڑ جاتی ہے۔ اُس کی نظریں بید کے درختوں سے ہوتی ہوئی قبرستان کے سارے احاطے میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ گو کہ یوسف کی تربت ادھر نہیں ہے...... پھر بھی......

ماں صاحب

یوں ہی رقصاں رواں پانی بہے گا، درختوں میں ہوا جھوما کرے گی
مری ہستی کی مٹھی بھر یہ مٹی، کہیں ذرّوں میں ذرّہ ہو رہے گی

جانماز پر بیٹھی ماں صاحب نے سر اوپر اٹھا کر خرم کی جانب دیکھا تو روشنی سے ماں صاحب کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

''خدا اس کی عمر دراز کرے بیٹا۔۔ابھی معصوم بچہ ہے۔۔ اگلے برس چلا جائے گا۔۔عمر پڑی ہے اس کی۔۔میں۔۔میں کتنے دن اور زندہ رہ لوں گی۔۔''

انہوں نے ادھ مندی آنکھیں میچ کر سر جھکا لیا۔مگر ان کے کان خرم کی آواز کے منتظر رہے۔

ان کے ماتھے کے قریب نظر آنے والے بال، سر پر اوڑھی چادر سے زیادہ سپید نظر آ رہے تھے۔تسبیح پھیرنے کی رفتار کے ساتھ آڑی ترچھی لکیروں والی ٹھوڑی اوپر نیچے ہو رہی تھی۔چھوٹی سی جانماز پر بیٹھی ماں صاحب سکڑتے سکڑتے اتنی ہو گئیں تھیں کہ اگر جانماز موجودہ سائز سے نصف کر دی جائے، جب بھی وہ اس پر بہ آسانی نماز ادا کر سکیں۔

ماں صاحب کب اتنی نحیف ہوئیں، پتہ ہی نہ چلا۔خرم کے دل میں یہ خیال آیا ہی تھا کہ پاس سے تیز چل کر اندر جانے کی کوشش میں ہانپتی شگوفہ پر نظر پڑی۔اس نے دونوں ہاتھوں کی بھری بھری انگلیوں سے کنپٹیاں ایسے تھام رکھی تھیں جیسے ہاتھ ہٹانے سے سر کے زمین پر گر جانے کا اندیشہ ہو۔چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا شگوفہ کا بھاری بدن رفتار کے ساتھ داہنے

بائیں جھکتا تھا۔ کمر کے معمولی طور پر سے نمایاں خم کو چھوڑ کر سارے جسم پر چربی نے قبضہ جما رکھا تھا۔

''ہے نا بیٹا۔۔ میں کتنے دن تک رہوں گی اب۔۔ ٹھیک ہے نا۔۔؟''

خرم نے نظریں اندر جاتی ہوئی شگفتہ سے واپس لا کر ماں صاحب کی طرف موڑیں۔ ماں صاحب دوبارہ گردن اوپر کیے آنکھیں جھپک جھپک کر بیٹے پر پُتلیاں مرکوز کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آنکھ کے آپریشن کے بعد ایک آنکھ کی پتلی کسی شے پر زیادہ دیر مرکوز کرتے وقت اس آنکھ میں بھینگا پن آ جاتا تھا۔ تسبیح فاطمہ کا ورد کر رہی ماں صاحب کی زبان ایک ردھم سے تالو سے لگتی تھی اور انگلیاں تسبیح کے دانوں پر تیزی سے چل رہی تھیں۔

بسمِلہ۔ خرم نیز زیرِ لب کہا تو عجب حسرت بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چھا گئی۔

''بسمِلہ۔۔'' زاہدہ نے بڑی بڑی سیاہ پتلیوں والی آنکھوں کو مزید پھیلا کر کہا اور لام کی آ

واز نکالتے وقت لاجوردی سے ہونٹوں والا دہانہ

وا کر کے تالو سے جاملتی زبان کا لام کہنے والا عمل سمجھانے کے لئے چار سالہ خیرو کے گول گول چہرے کے عین سامنے اپنا چہرہ لے جانے کے لئے فرش پر بیٹھ گئی۔

''ایسے ہی کہا تھا۔۔ ہم نے بھی۔۔''

خیرو نے روٹھی روٹھی آواز میں کہا اور ہاتھ میں تھا ما چمچ ہفت رنگ پھولوں والی تام چینی کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

''نہیں کھائیں گے۔۔ ہم۔۔'' اس نے زاہدہ کی زبان کی طرف دیکھا جو لام کہہ کر ابھی ابھی تالو سے الگ ہوئی تھی۔

''کیوں نہیں کھائیں گے۔۔'' زاہدہ نے کچھ اونچی آواز میں کہا اور ہاتھوں میں تھامی خیرو کی

دونوں کلائیاں جلدی سے چھوڑ دیں۔

ایسے میں اس کی چوڑیاں چھن سے بجیں تو خیرو اس کے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔

''اس لئے کہ آپ نے زور سے پکڑے تھے۔۔ہاتھ ہمارے۔۔''

اس نے دھیرے سے کہا پھر زاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف موڑا جہاں سے دستر خوان پر چنی نعمتیں نظر آنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔اور خاص کر باریک سفید چینی کی قاب جس کے پار سے دسترخوان کے سرخ پھول تک نظر آتے تھے اور جس میں زاہدہ نے اس کی پسند کی ضیافت یعنی نرم نرم آلو کے بھورے بھورے قتلے پروس رکھے تھے۔

تام چینی کی رکابی اپنی طرف سرکاتے ہوئے زاہدہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہم کھلائیں گے اپنے بچے کو۔۔مگر پھر بچے کیسے سیکھیں گے اگر سمجھایا نہ جائے۔۔آپ لام پر تشدید بھول جاتے ہیں نا۔۔''

زاہدہ نے اسے اپنے زانو پر بٹھایا۔

''دھیرے سے ہاتھ پکڑ کر بھی تو سمجھایا جا سکتا تھا نا۔۔''

خیرو زاہدہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں زاہدہ ہی کی طرح بار بار پلکیں جھپک کر بولا کہ اب اور روٹھے رہنا قتلوں کے ضائقے کو ترستی زبان کے لئے ممکن نہ تھا۔وہ تتلاتا نہیں تھا اور اس کی زبان بھی صاف تھی۔زاہدہ کو ہنسی آئی تھی مگر وہ مزید ذرا گہرا سا مسکرا کر رہ گئی۔

''اوہ ۔۔اس کے لئے ہم معافی مانگتے ہیں۔۔''

زاہدہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا تو خیرو نے دیکھا کہ سیلینگ کے درمیان میں لٹک رہے فانوس سے ملتے جلتے جھمکوں کے ساتھ بندھے بہت سے چھوٹے چھوٹے سرخ موتی (جو ہلکے ہلکے جھولا سا جھولا کرتے تھے) زور زور سے ہلنے لگے تھے۔زاہدہ نے کانوں سے ہاتھ ہٹائے تو ننھے ننھے سرخ موتیوں سے نظریں ہٹا کر خیرو نے رکابی کی طرف دیکھتے ہوئے منہ

بڑا سا کھول دیا۔موتی خرگوش کی آنکھ کی طرح چمک رہے تھے مگر خرگوش کی آنکھ سے بہت چھوٹے تھے۔اس نے ایک اور سیکنڈ کے لئے زاہدہ کے کانوں کی طرف نظر ڈالی اور پھر رکابی کی جانب دیکھنے لگا۔زاہدہ آلو کو کانٹے میں پروئے پھونک مار کر ٹھنڈا کر رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں قتلہ خیرو کے منہ میں آنے والا تھا۔

''اب ہمارا بچہ جلدی جلدی کھائے گا۔۔۔پھر ابو کے ساتھ تھوڑا سا کھانا بھی کھاتے ہیں نا اچھے بچے۔۔''

زاہدہ نے اس کے گال پر ایک بوسہ ثبت کیا۔

''جی۔۔''

آلو چباتے ہوئے وہ سر ہلا ہلا کر جھومتے ہوئے بولا تھا۔

جب تک خیرو کے ہاتھ پاؤں تھوڑے لمبے ہوئے تھے، وہ زاہدہ کے ہی ہاتھ سے آلو کے قتلے کھاتا تھا کہ اوپر سے ٹھنڈا نظر آنے والا گستاخ قتلہ منہ کے اندر جاتے ہی اس کی زبان جلا دیتا۔مگر پھر اپنے ہی ہاتھ سے کھانے سے بھی ایسا اکثر ہی ہونے لگا تھا اور وہ دہانہ وا کر کے زور زور سے سانس اندر باہر کر کر کے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا تو زاہدہ جانے کہاں سے پانی لئے آ پہنچتی۔

انہوں نے کیسے سانس کی آوز سن لی تھی اتنی دور سے۔خیرو سوچ کے رہ جاتا۔

''اگر ہم گھوم گھوم کر کھائیں گے تو پانی ساتھ کیسے رہے گا۔۔''

وہ جب بھی سمجھانے کے ہی انداز میں کہا کرتی۔

خیرو نے اپنے ساتھ زاہدہ کو بھی بڑا ہوتے دیکھا تھا۔مگر جب اس کا قد اور لمبا ہوا

تو اس کی دونوں چچیاں موٹی ہوگئی تھیں اور ان کے اچھے اچھے کپڑے ان کی کمر میں پھنس جاتے تھے اور کبھی کبھی وہ گاؤ تکیے سی لگتیں تھیں۔ مگر زاہدہ پہلے کی ہی طرح تھی۔ مشن سکول کی پیرینٹ ٹیچر میٹنگ میں جب بچے کہتے کہ خیرو کی مدر بہت کیوٹ ہیں تو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ خیرو نے زاہدہ کو ہمیشہ بچوں کی ہی طرح پلیٹ میں تھوڑا سا کھانا لیتے دیکھا تھا۔ گھر کے لوگ کھانے پینے کے خاصے شوقین تھے۔ خیرو کے ابو بھی دیر تک کھانے کی میز پر نظر آیا کرتے۔

زاہدہ پانچ نمازوں کے علاوہ بھی کچھ اور نمازیں پڑھا کرتی اور رمضان کے علاوہ بھی کئی روزے رکھا کرتی۔ گھر میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی۔ چادریں کاڑھنے سے لے کر ملازمین کے ساتھ مل کر باغیچے کے حوض صاف کرنے تک۔ کچن گارڈن میں پھول سبزیاں اُگانے تک۔ اور زاہدہ کو پودوں میں پانی کھاد ڈالنے اور کھانا بنانے جیسے کام کرتے دیکھ کر خیرو خیر سے بڑا ہو گیا تھا۔

یہ بیسویں صدی کے وسط کے آس پاس کے دن تھے۔ لوگ کچھ سرحد پار ہجرت کر گئے تھے۔ بعض اپنی زمینوں سے لگے رہے۔ جاگیریں ضبط ہونے لگیں تو محنت کش لوگ سر اٹھا کر جینا سیکھنے لگے۔ بدلتی اقدار سے جب ستحصال شدہ لوگوں نے آرام طلبوں کو جی کھول کر مذاق کا نشانہ بنایا تو زاہدہ اس کی شکار نہ ہوئی کہ اس کی ملنسار طبیعت ہر دل عزیز تھی۔ زمینوں کو مستقل قسم کا سرمایہ سمجھنے والے گھر کے حاکموں نے صرف پیسہ جمع کیا تھا۔ مستقبل کے لئے کسی قسم کی سرمایہ کاری کر کے مالی حالات کو مظبوط نہیں کیا تھا۔ زمینوں کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ جمع شدہ پیسہ بھی ختم ہوتا گیا۔

دونوں دیور منقولہ جائداد کا بڑا حصہ لے کر ہجرت کر گئے۔ اُن کی والدہ ان کے ساتھ نہیں گئی تھیں۔ وہ اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے پاس
رہیں۔ اور ان کا خیرو سے بھی دوستانہ رشتہ تھا۔ زاہدہ کے شوہر کا انہی دنوں انتقال ہو گیا۔ پھر

والدہ بھی زیادہ دن تک زندہ نہیں رہیں۔
مگر گھر کا ظاہری رکھ رکھاؤ ویسے ہی قائم رہا۔ خیرو کی تعلیم بلکہ کچھ اور اہتمام سے جاری رہی ۔ دبلی پتلی ناخواندہ ماں کے کام کی صلاحیت اور

مستقبل کے مشوروں پر خیرو کی عقل حیران رہ جایا کرتی۔
اپنے ساتھ اس نے ماں کو بھی بدلتے دیکھا تھا۔ جب چھوٹا تھا تو ماں کے ہاتھوں میں بہت سی چوڑیاں ہوا کرتیں۔ لباس کے رنگوں جیسے آویزے اور کنگن۔ ماتھے کے اطراف اس کے بال لہراتے بہت اچھے لگتے۔ جب ماں اسے گود میں لیا کرتی تھی تو اس کے کندھے کے پاس سے چنبیلی کے پھولوں کی سی خوشبو آتی جس کی بیل باغیچے کے پیچھے والے کونے میں جھولے کے قریب کی دیوار پر چڑھی رہتی۔ خیرو جب دسویں درجے میں تھا تو ماں نے چوڑیاں بندے پہننا چھوڑ دئے تھے۔ صرف کلائی میں گھڑی تھی اور گلے میں چھوٹے موتیوں کی بڑی سی مالا۔ وقت سے پہلے ہی ماتھے کے اطراف بال خاصے سفید ہو چلے تھے اور سفید موتیوں کی مالا کے ساتھ خوب جچتے تھے۔ خدا حافظ کہتے وقت ماں اس کے ماتھے کا بوسہ لیتیں تو ان کے پاس سے وہی گلِ یاسمین کی مہک آیا کرتی۔
ماں صاحب جب اور بڑی ہو گئیں اور خرم بھی بڑا ہو کر اور بڑا افسر بن گیا تو ماں نے اس کے لئے اسی کی طرح پڑھی لکھی اور ہری ہری آنکھوں والی دلہن ڈھونڈ لی جو خود بھی بڑی افسر تھی۔
ماں صاحب نے گھر سنبھالے رکھا اور دلہن کی زچگی بھی ماں کی ہی طرح کر کے اسے دفتر کے لئے چاق و چوبند کر دیا۔ ماہم کی دیکھ بھال خود کرتی رہیں اور پھر کوئی تین برس بعد قیصر کی بھی ۔ ماں صاحب نے بیٹے کے بچوں کی بھی اسی انداز سے عمدہ پرورش کی گو کہ وہ اب پہلے کی نسبت کمزور ہو گئی تھیں۔ خاندان بھر میں اور خاندان سے باہر بھی ماں صاحب کے ایسا احترام اور کسی کو نصیب نہ تھا۔

ماہم پڑھ لکھ کر برسرِ روزگار ہوئی تو اسے بداع کر دیا گیا۔ جب ہی پھر ماں صاحب کو زرا دم لینے کی فرصت ملتی محسوس ہوئی۔ اور پھر انہوں نے حج کو جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خرم بخوشی تیار ہو گیا۔

''تمہیں بھی چلنا ہو گا میرے ساتھ بیٹے۔۔'' ماں صاحب مسکرا دیں۔

''کوئی محرم چاہئے نا۔۔ اور پھر تمہیں بھی تو۔۔''

''جی ماں صاحب۔۔ میری بھی شدید چاہت ہے۔۔ انشااللہ۔۔''

قیصر کی پڑھائی کا معاملہ نہ ہوتا تو شگوفہ کو بھی لے چلتے۔۔''

خرم نے پراٹھے پر بالائی لگاتی ہوئی شگوفہ کی طرف دیکھا۔

''آپ کا بجٹ ہے اتنا۔۔؟'' شگوفہ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''ہاں۔۔ کھینچ کھانچ کے۔۔ اگر بلاوا ہوا تو۔۔''

''اتنے خرچے کے بعد بھی؟ سب بڑی بڑی رقوم تو نکال لیں ہم نے۔۔''

''اچھا۔۔؟'' ماں صاحب نے موٹے چشمے کے پیچھے سے ایک نظر سب کو دیکھا اور ابلی ہوئی لوکی پر چھڑکی گئی دھنئے کی پتیوں کی خوشبو سے محظوظ ہو کر مسکرا دیں اور نمک دانی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خرم نے نمک ان کی طرف سرکایا۔

''بس زرا سا۔ ضرورت نہیں ہوتی اتنے نمک کی انسان کو۔۔''

''یہ بات زرا انہیں بھی تو سمجھائے نا۔۔''

خرم نے شگوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور مسکرایا۔

''شگوفہ کو۔۔؟'' ماں صاحب بھی مسکرائیں۔

'' کہاں کا شگوفہ ماں صاحب۔۔ یہ تو جانے کب کی پھول ہو گئیں اور وہ بھی سورج مکھی کا۔۔ وہ اس لیئے کہ اس سے بڑا کوئی اور پھول نہیں ہوا کرتا غالباً۔۔''

''قیصر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''ہوتا ہے پاپا۔۔گوبھی کا۔۔''

اس نے کہا تو ماں نے مصنوعی غصے سے دیکھا۔

''مام۔۔نظر لگا رہے ہیں ڈیڈ آپ کے ڈنر کو۔۔'' شگوفہ بھی مسکرائی۔

''لگانے دو جی۔۔ہم پھر بھی وہی کھائیں گے جو جی چاہے گا۔۔اصل میں خود انکا جی للچا رہا ہے۔۔ماں صاحب کے ڈر سے نہیں کھا رہے۔۔''

''مجھے چشمے کے پیچھے سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتا۔۔جسے جو چاہے کھا سکتا ہے۔۔''

سب نے قہقہہ لگایا تو ماں صاحب سر جھکائے مسکرائیں۔

کبھی کبھی چلتا ہے۔۔''

انہوں نے پرخلوص سی آواز میں کہا۔

ماں صاحب اور خرم حج سے لوٹے تو شگوفہ اور گھر کا ملازم کئی روز تک مبارک بادیوں کے تقاضوں میں گھرے رہے۔کئی روز تک روزانہ کا سکیڈیول متاثر ہوتا گیا۔ہفتوں بعد کہیں کچھ سکون میسر ہوا۔

رات شگوفہ خوابگاہ میں آئی تو خرم میز پر کچھ کاغذ دیکھ رہا تھا۔

''باہر جانا چاہتے ہیں صاحب زادے۔۔''انہوں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''جی۔۔کوئی ڈپلومہ ہے دو سال کا اور اس کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا انشااللہ۔۔''

''مگر فیس ڈالر، پاؤنڈ یا یورو میں ہوگی۔۔پتہ ہے آپ کو۔۔''

''ہے تو۔۔مگر بچے کا مستقبل بھی تو دیکھنا ہے نا۔۔اور اگر کم ہو تو وہ پانچ سال والی ایف ڈی میچور ہونے والی ہے۔۔''

''ہاں ہے تو مگر وہ نومبر میں ہوگی اور رقم مارچ میں چاہئے۔۔میں وہی دیکھ رہا تھا۔۔''

''اس ایف ڈی پر لون بھی مِل سکتا ہے۔۔کچھ انٹریسٹ میں کمی ہو سکتی ہے مگر۔۔''

''توڑا بھی جا سکتا ہے اسے۔۔مگر پھر سارا ہی انٹریسٹ لوز ہو جائے گا۔۔''

''کوئی اور چارہ بھی نہیں۔۔''اس نے شوہر کے چہرے کی جانب دیکھا اور الماری سے رات کو پہننے والا لباس نکالنے لگی۔

دور کوئی کتا زور زور سے بھونک رہا تھا۔

اگلی صبح برآمدے میں ناشتے کے دوران ماں صاحب نے بتایا کہ رات ان کی چھاتی میں ہلکا سا درد اٹھا تھا۔

''کس طرف۔۔؟داہنے یا بائیں۔۔''خرم نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

ماں صاحب نے جب بائیں کہا تو خرم نے چائے کا پیالہ چھوڑ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

''آپ تیار ہو جائے۔۔میں چینج کرتا ہوں۔۔ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں پوری طرح چیک اپ کرانا ہوگا۔۔''

''ابھی بھی تکلیف ہے۔۔؟''شگوفہ نے پوچھا۔

''نہیں۔۔''

''تو پھر کوئی خاص بات نہ ہوگی انشااللہ۔۔تیزابیت سے بھی بھاری پن ہو جاتا ہے اور دھڑکن تیز اور تکلیف سی محسوس ہوتی ہے۔۔''

شگوفہ نے کہا۔

''ہاں بیٹا۔۔پھر بھی۔۔مجھے ڈر سا لگ رہا ہے ۔۔نرسنگ ہوم لے چلنا مجھے۔۔''

''ہاں سب چیک کروائیں گے ماں صاحب آپ فکر نہ کریں۔۔'' خرم اندر چلا گیا۔
''کچھ نہیں ہوا ہے۔۔سب ٹھیک ہے۔۔بلا وجہ۔۔'' شگوفہ نے سامنے کی دیوار پر اخروٹ کی لکڑی سے منقوش آیت الکرسی کو ابرو اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور لمبا سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اور واقعی کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہر طرح کی جانچ صحیح نکلی۔سب مطمئن ہو گئے مگر خرم نے محسوس کیا کہ ماں صاحب اکثر و بیشتر کراہتیں ہیں۔
ویسے ماں صاحب کا معمول بھی نہیں بدلا تھا اور صحت بھی ٹھیک نظر آتی تھی۔وقت سے کھانا پینا بھی ہوتا تھا۔رات کو آرام سے سوتی بھی تھیں
اور رات کی عبادت بھی حسب سابق جاری تھی ۔مگر جب بھی خرم کے کانوں میں ان کے کراہنے کی آواز پڑتی، وہ بے سکون ہو جاتا۔لپک کر ان کے پاس جا پہنچتا۔پوری تسلی کرتا کہ سب خیریت ہے۔

''ماں صاحب ٹھیک تو ہیں نا آپ۔۔کیوں کراہ رہی تھیں۔۔؟''
''میں ٹھیک ہوں بیٹا۔۔ دفتر جا رہے ہو۔۔آؤ دعا دم کر دوں ۔۔پھر میں چاشت میں مصروف ہو جاؤں گی۔''
انہوں نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا پڑھی ۔ان کے پاس سے گلِ یاسمین کی خوشبو آ رہی تھی جس سے خرم پچاس سال سے مانوس تھے۔
''جاؤ اللہ حامی و ناصر ہو۔۔''
''ٹھیک ہیں نا آپ ماں صاحب۔۔''
خرم نے باہر کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے پوچھا۔

''ہاں بالکل۔۔بے فکر ہو کر جاؤ۔۔''

لابی میں لوٹا تو چائے کی پیالی پر بھاپ جیسی کوئی شے نظر نہ آئی۔

''ناشتہ کیے بنا اٹھ گئے۔۔؟''

شگوفہ نے پیالی ان کے سامنے سے سرکائی اور ٹی کوزی ہٹا کر کیتلی کو چھووا۔ پھر گردن باورچی خانے کی طرف اچکائی۔

''ظفر دوسرا کپ دینا۔۔''اس نے ہلکے سے پکارا۔

''گرم ہے۔۔''وہ کیتلی سے ہلکا سنہرا گرم گرم پانی پیالی میں انڈیلنے لگی۔

''لیجیے۔۔''

''گھبرا جاتا ہوں میں۔۔''

وہ شکر اپنی طرف سرکا کر بولے۔

''بلاوجہ گھبراتے ہیں آپ۔۔''

''سوچتا ہوں ہمارے لئے کیا نہیں کرتی رہتیں ماں صاحب۔۔کہیں مجھ سے کوئی کمی نہ رہ جائے۔۔''

''کس چیز کی کمی۔۔وہ ماشاللہ بالکل تندرست وتوانا ہیں۔۔''

''مگر اس دن کی تکلیف کے بعد کراہتی کیوں رہتی ہیں پھر۔۔؟''

''آپ ہی کی موجودگی میں یہ آواز سننے کو ملتی ہے۔۔ورنہ دن بھر تو۔۔''

''کیا تم روایتی بہوؤں کی طرح۔۔کبھی انہوں نے روایتی ساس جیسا برتاؤ کیا ہے تمہارے ساتھ۔۔''

''آپ یہ الزام نہ دیجئے۔۔ساری رات عبادت میں گزارتی ہیں ہمیشہ کی طرح۔۔کمرہ ہم سے زیادہ دور تو نہیں۔۔جب ان کے درود وتلاوت کہ آواز کانوں میں پڑ سکتی ہے تو۔۔؟''

''وہ تو میری کچی نیند کے سبب اونچی آواز میں کہاں پڑھتی ہیں۔۔''

''تو کراہتی ہیں رات کو کیا۔۔کبھی سنا آپ نے۔۔؟''

''نہیں۔۔سنا تو نہیں۔۔شاید۔۔''

''اگر کراہتیں تو آپ ضرور سنتے۔۔''

''برداشت کا مادہ ہے ان میں بہت۔۔سہہ لیتی ہوں گی۔۔''

''پھر دن میں کیوں نہیں سہہ پاتیں۔۔''

''دن میں سب گھر میں ہوتے ہیں جاگ رہے اسی لئے شاید۔۔''

''ہاں شاید۔۔شاید یہ ہی بات ہوگی۔۔''

شگوفہ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

''یہی ہوگا۔۔مگر آپ پریشان نہ ہوں۔۔ماشااللہ سے تندرست ہیں۔۔''

خرم چائے پینے لگا۔تو ملازم آکر میز کے دوسرے کنارے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''رات میں کیا بنے گا میم صاحب۔۔''

''کیا کھائیے گا۔۔''شگوفہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''جو آپ کھلائیے گا۔۔''خرم نے سر کاندھے کی طرف خم کیا۔باہر سے کوئی بانسری بیچنے والا ایک پرانی فلم کی دھن بجاتا گزرا۔

خرم نے پیالی خالی کر کے پرچ میں زرا اونچی آواز سے رکھی اور نیچی آواز میں گاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''تن ڈولے میرا من ڈولے میرے دل کا گیا قرار رے۔۔''وہ کمرے کی طرف گیا تو شگوفہ بھی مسکراتی پیچھے چل دی۔

''گوبھی گوشت چلے گا۔۔''شگوفہ نے مسہری پر رکھی نیلے مہین مہین خانوں والی سفید قمیض کو

نظر بھر کے دیکھا اور الماری سے نیلی ہری آڑی دھاریوں والی ٹائی نکال کر خرم کو پکڑائی۔
''ضرور چلے گا۔۔'' وہ ٹائی باندھنے لگے تو شگوفہ باورچی خانے کی طرف لوٹی۔ ملازم ریفریجریٹر میں سے سر ڈالے 'تن ڈولے' کا اگلا حصہ گنگنا رہا تھا۔
''میرے دل کا گیا قرار رے کون بجائے بانسریا۔۔'' شگوفہ دروازے پاس زرا سا ٹھٹھکی اور کھنکار کر اندر گئی۔ ظفر نے ہونٹ سی لئے اور سر باہر نکالا۔

''ادرک ہے ہی نہیں۔۔'' وہ جلدی سے بولا۔
''گوبھی گوشت بنے گا۔۔ اور وہ بلیک بینز بنانا۔۔ کالی دال۔۔ اور ماں صاحب سے پوچھو جا کر کچھ اور لانا ہو تو۔۔ کچھ کہہ رہی تھیں لانے کو

گھیا کے علاوہ۔۔ پھر جلدی مارکیٹ جاؤ۔۔ اور یہ سر اتنا اندر کیوں ڈالتے ہو عقل مند آدمی۔۔ سبزی والا ڈبہ نکال لیا کرو۔۔ اس بہانے دھل بھی جائے گا۔۔''
''کل ہی دھویا تھا خدا کی قسم۔۔''
''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔۔ اب شروع ہو جانا قسم پر قسم۔۔'' شگوفہ باورچی خانے سے باہر نکلی۔
''اب قسم نہیں کھاؤں گا میم صاحب خدا کی قس۔۔ اوہ۔۔'' ظفر نے دروازے تک آ کر فوراً کہا اور واپس اندر گیا۔

اس شام خرم کچھ دیر سے لوٹا کہ بیٹے کے لئے ٹریولرس چیکس (traveller's cheques) وغیرہ کا کام تھا۔ شام کو قیصر بھی ان کے ہمراہ گیا تھا۔ سب کچھ توقع کے مطابق ٹھیک ہوا تھا۔
رات کے کھانے کے بعد ماں صاحب کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی تو خرم بے قرار

ہو گیا۔

''ماں صاحب کو پھر تکلیف ہے دیکھتا ہوں۔۔''

وہ اٹھ کر ان کے کمرے کی طرف گیا۔

''سوئے نہیں بیٹا۔۔'' وہ دھیرے سے بولیں۔

''بس سونے ہی والا تھا ماں صاحب۔۔آپ کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے۔۔''

''میں ٹھیک ہوں۔۔تم کیوں فکر مند ہو جاتے ہو۔۔''

''مگر آپ کیوں کراہ رہی تھیں۔۔؟''

''میں کچھ نہیں۔۔ٹھیک ہوں میں۔۔تم۔۔میں۔۔''

شگوفہ بھی کمرے میں داخل ہوئی۔

''تم لوگ آرام کرو۔۔کچھ فکر کی بات نہیں۔۔'' ماں صاحب نے گہری سانس لی۔

''بس میرا جی چاہتا ہے کہ۔۔۔۔''

''کیا ماں صاحب۔۔؟''

''ایک بار عمرہ کے لئے جاؤں۔۔۔''

زاہدہ خانم نے دونوں کو باری باری دیکھا۔

''تو ٹھیک ہے۔۔جیسا آپ چاہیں ماں صاحب۔۔''

خرم فوراً مسکرایا۔

''مگر تمہیں بھی چلنا ہوگا۔۔یا قیصر کو۔۔محرم کے بغیر تو ممکن۔۔''

ماں صاحب نے پھر بہو بیٹے دونوں کو دیکھا۔

''یہ۔۔یہ۔۔کیسے کرتے ہیں۔۔سوچتے ہیں ماں صاحب۔۔آپ بے فکر ہو کر آرام کریں۔۔کچھ کرتے ہیں۔۔''

شگوفہ نے ماتھے پر ہلکا سا بل ڈال کر شوہر کو دیکھا پھر ماں صاحب کی طرف (بغیر بل ڈالے) بھی۔

''قیصر بھی آ سکتا ہے بیٹا۔۔اس کے امتحان بھی ہو گئے ہیں۔۔، چھ مہینے کے لئے وہ بھی آزاد ہے۔۔آ جائے گا ساتھ میرے۔۔مشکلیں حل کرے گا اللہ اس کی۔۔''

''مگر ماں صاحب اسے کوچنگ کا کورس جوائن کرنا ہے۔۔ابھی بچہ ہے انشااللہ آگے چل کر ۔۔کرے گا جج بھی اللہ نے چاہا تو۔۔ابھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔۔'' شگوفہ نے جلدی سے کہا۔

''ہاں انشااللہ ضرور کرے گا۔۔میں محرم کی وجہ سے۔۔خیر خرم ہی چلے تو۔۔''

''آپ آرام کیجئے ماں صاحب۔۔کچھ کرتے ہیں۔۔''

خرم نے انہیں مصنوعی ریشم کے نرم نرم ریشوں سے بھری گئی ساٹن کے غلاف والی نیلی رضائی اوپر تک اڑھا دی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔شگوفہ اس کے آگے آگے تھی۔کمرے میں پہنچے تو شگوفہ کا سانس پھول رہا تھا۔

''ہانپ رہی ہو تم تو دو قدم چل کر۔۔وزن کم کر لو اپنا شگوفہ بیگم۔۔ورنہ ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔۔ایسے بھی ابھی ہم جوان لگتے ہیں۔۔اور ویسے بھی وہ تمہاری خدمت کرے گی ۔۔اور جیسے تیسے میں نبھا لوں گا۔۔''

خرم خود کو آئینے میں اور دراصل شگوفہ بیگم کو دیکھ کر مسکرائے جو آئینے کے اندر مسہری پر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔

''آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔۔؟ ویسے آپ سے کیا بعید ہے۔۔'' اس نے ایک نظر آئینے میں دیکھ کر گردن جھٹکی۔

''اچھا۔۔؟ ابھی بھی شکوک نے پیچھا نہیں چھوڑا آپ کا۔۔ کتنے ثبوت دے دئے ہم نے وفا کے۔۔ہمیں کوئی آپ جتنا خوبصورت نظر نہیں آتا ورنہ۔۔۔''

''نظر نہیں آتا۔۔کسی اور سے کہئے جا کر۔۔خیر میں سنجیدہ بات کرنا چاہتی ہوں اور آپ۔۔''

''سنجیدہ بات۔۔اچھا اب بتایئے اگر سچ مچ ہی ہمیں وہ آپ کی رشتے کی بہن جس کی ہم نے بھول سے ایک بار تعریف کر دی تھی، پسند آ جاتی اور ہم آپ کو آئے دن خدانخواستہ طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے تو آپ کی زندگی تو۔۔''

خرم اپنے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بیگم کی طرف پلٹے۔

''جہنم ہو جاتی۔۔ٹھیک سمجھا آپ نے۔۔مگر ہم جہنم میں رہنے کے قائل نہیں ہیں۔۔یہ آپ بھی جانتے ہیں۔۔ہم نے راستے الگ کر لئے ہوتے۔۔''

شگوفہ بیگم کا لہجہ سخت سا ہو گیا۔

''دیکھئے اس ذکر سے ہی آپ ٹینس ہو جاتی ہیں۔۔خدا کا شکر ہے کہ آپ کا شوہر ایسا نہیں ہے۔۔سوچئے اگر سچ مچ ہی کسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہو تو اس کا کیا حال ہو جائے گا۔۔''

''زندہ درگور ہو جائے گی۔۔''

شگوفہ نے پاؤں سمیٹ لئے اور پیچھے ہو کر تکیہ درست کرنے لگی۔

''ہاں آپ نے بالکل سچ کہا۔۔ایسا ہی ہوا تھا۔۔''

''کب۔۔؟ کس کے ساتھ۔۔کس کی بات کر رہے ہیں آپ۔۔؟''

خرم نے کنگھا میز پر رکھ دیا اور ایک لمبی سانس لیتے اس کے برابر آ بیٹھے۔

خورشید عالم نے گھٹنوں تک آ رہے لمبے سفید جوتے کرسی کے قریب اتار کر اوورکوٹ

کرسی کی پشت کو گویا پہنا سا دیا۔اور چائے کی میز کی طرف دیکھتے ہوئے ایک نظر آتش دان میں سلگتے ہوئے انگاروں کی طرف ڈال کر کھانے کی کرسی پر آ بیٹھتے۔

''تو کوئی فائدہ نہ ہوا تمہیں باہر بھیجنے کا۔۔''انہوں نے سر جھٹک کر، چائے بنا رہی بیگم کی طرف نظر اٹھائی اور سامنے کی کرسی پر بیٹھے اپنے صحت مند جوان بیٹے کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔

''نقصان ہی ہوا الٹا۔۔''بیگم خورشید اُداسی سے بولیں۔

''کہاں کمی رہ گئی ثاقب۔۔ قصبے کے اہم اور اکلوتے مشن سکول میں تمہیں تعلیم دلوائی ۔۔سینٹ جوزف میں۔۔آکسفرڈ بھیجا۔۔کیوں تمہارا پڑھائی میں دل۔۔''

''آکسفرڈ نہیں کیمرج ابا جی۔۔'' ثاقب جانتا تھا کہ موضوع بدلنے کا یہ ہی یک کارگر طریقہ ہے۔۔''

''دونوں اہم ہیں۔۔کیمرج اسی کی اصل میں ایک شاخ ہے۔۔اور تم۔۔لندن کی سب سے پرانی یونیورسٹی آکسفرڈ میں جس کے والد نے تعلیم حاصل کی ہو اس کی پہلی اولاد اس عمر تک آ کر بھی چھوٹے بچوں کی طرح پڑھائی سے جی چرائے۔۔اور۔۔''

خوشید عالم پیالی کو چھو کر رہ گئے۔

''کتنی پرانی ہو گی یونیورسٹی ابا جی۔۔کوئی۔۔؟''

''لیجئے۔۔یہ موضوع کو کیسے۔۔''وہ بے بسی سے بیگم کی طرف دیکھ کر بولے۔

''نہیں ابا جی میں واقعی جاننا چاہتا تھا۔۔کوئی گیارہویں صدی کہتا ہے کوئی بارہویں۔۔''

ثاقب بھی ماں کی جانب گویا بے بسی سے دیکھنے لگا۔

''اب جو بھی ہے۔۔کوئی۔۔ابھی پچھلی صدی میں تمہاری پیدائش سے کوئی صدی بھر قبل یعنی۔۔سن ۱۸۲۳ میں اس کی یونین۔۔آکسفرڈ یونین بننے کے بعد سے۔۔بننے کے بعد۔۔جانتے ہو بڑے بڑے لیڈر اور Nobel Laureates پیدا کئے ہیں اس نے۔۔''

''پہلے بہت جھگڑے ہوا کرتے تھے نا تعلیم کو لے کر وہاں۔۔ چرچ کی تعلیم کے خلاف سمجھتے تھے لوگ یونیورسٹی میں پڑھنے کو۔۔ اور سٹوڈنٹس کے ساتھ بھی ہوئے تھے نا جھگڑے۔۔؟''

''ہاں۔۔ بند ہونے سے بچانا پڑا تھا بڑی مشکل سے منتظمین کو اسے۔۔ مگر یہ تو ہمیشہ ہی سماج میں ہوتا ہے۔۔ کوئی نئی چیز اپنے ساتھ متضاد خیلات تو لاتی ہی ہے۔۔ اور جیت ہمیشہ صحیح بات کی ہوتی ہے۔۔ مگر تعجب ہوتا ہے۔۔ وہ علمی ماحول۔۔ وہ سبزہ زار۔۔ وہ چناروں جیسے میپل ٹریز۔۔ وہ کشادہ باغات۔۔ وہ پرشکوہ عمارتیں۔۔ کلس گرجے۔۔ راستے۔۔ کوئی تمہیں تعلیم کی طرف راغب نہیں کر سکا۔۔ کتنا شوق تھا مجھے تمہاری اسناد میں تاج پر رکھی کھلی کتاب کے دونوں صفحات پر مزید دو تاج سنبھالے علم کی دنیا کا وہ بے مثال نشان دیکھنے کا۔۔ اپنے جیسا۔۔ یا ایسا ہی کوئی اور اہم نشان۔۔ ایک پورا شہر۔۔ ایک پورا تعلیمی شہر۔۔ ایک پوری علمی کائنات بھی تمہیں تعلیم کی طرف راغب نہ کر سکی

۔۔ اور آخرِ کار تم نے فیصلہ ہی کر لیا کہ۔۔''

انہوں نے مکھن لگی پتلی سی روٹی کا ادھ چپا ٹکڑا کلے میں دبائے جواب دیا اور پھر اسے عجلت سے نگل کر بیٹے کی جانب غصے سے دیکھنے لگے۔۔ مگر تم۔۔ یہ بچوں کے سے سوالات پوچھ کر میرا اور اپنا وقت کیوں ضایع کرتے ہو۔۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ اتنی جائداد۔۔ یہ امپائر جو میں نے کھڑی کی ہے اسے۔۔ اسے کس کو سونپ کر جانا چاہتے ہو تم۔۔ وہ دونوں تو بہت چھوٹے ہیں۔۔ تم بڑے ہو۔۔ کتنی امیدیں وابستہ تھیں تم سے میری۔۔''

انہوں نے گردن خم کر کے ہاتھ میز پر اوندھے رکھ دئے اور بیٹے پر نظریں مرکوز کر لیں۔

''اچھا آپ۔۔ آپ کا دل لگتا ہے یہاں۔۔ سچ بتایئے ابا جی۔۔ میں۔۔''

''نہ لگتا تو میں یہاں آ کر کیوں بس جاتا۔۔ گرم خطے کا باشندہ ہو کر بھی۔۔ یہ جگہ لندن سے کم نہیں معلوم ہوتی مجھے۔۔ یہ ہماری اپنی سرزمین ہے۔۔ اور پھر کمی کیا ہے۔۔ کس بات کی کمی ہے۔۔ ایسے باعزت عہدے پر فائز ہوں۔۔ گھر بار زمینیں باغ سب یہاں ہے۔۔ اور یہ

سب مجھے ساتھ نہیں لے جانا۔۔اور تم۔۔کیسے سمجھاؤں تمہیں میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔"

" مگر مجھے۔۔مجھے۔۔یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا اباجی۔۔اگر اس سب کو بیچ کر ہم لندن میں بزنیس کریں اور کسی لارڈ کی طرح رہیں۔۔"

اس نے بالکل بچوں کی طرح کہا۔

"چپ رہو۔۔میں نے تمہیں اوکسفرڈ کاروبار کے لئے نہیں تعلیم کے لئے بھیجا تھا۔۔میری موت کے بعد ہی۔۔تم۔۔تم۔۔اور لارڈ۔۔یوں ہی نہیں بن جاتا کوئی۔۔بغیر محنت اور عزت کمائے لارڈ۔۔تم میں یہ دو چیزیں ہیں؟۔۔تم۔۔؟" خورشید عالم کھانسنے لگے تو بیگم نے غصے سے بیٹے کی طرف دیکھا۔وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"سوری۔۔میں۔۔" اس نے باپ کی طرف نظر اٹھا کر جھکالی۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔۔مجھے شک ہے کہ۔۔کہ۔وہاں تم۔۔"

وہ کچھ کہتے ہوئے رک گئے اور کمرہ چھوڑ کر جاتے ہوئے بیٹے کی جانب دیکھتے بیگم کی طرف پلٹے۔

"اس نے کہیں شادی تو نہیں کر لی وہاں۔۔میں نے اسے غلط کیا بھیج کر۔۔اس کا تو کبھی تعلیم میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔یہیں باغ واغ سنبھالتا۔۔اب تو یہ ہاتھ سے نکل ہی۔۔"

"نہیں خدا نہ کرے۔۔کچھ بھی ہو وہ شادی نہیں کر سکتا وہاں آپ کی مرضی کے بغیر۔۔بھانجی میری منگیتر ہے اس کی۔۔جانتا نہیں کیا۔۔آپ بھی کہاں کی سوچنے لگ جاتے ہیں۔۔"

"غصے میں۔۔میں۔۔میں کہیں اسے عاق۔۔"

"کیا کہہ رہے ہیں یہ آپ۔۔سن لے گا تو چلا جائے گا ناراض ہو کر۔۔پھر کیا کریں گے اس سب کا۔۔دیوانے ہو جائیں گے ہم دونوں۔۔ابھی بھی باہر جاتا ہے تو کیا میری طرح آپ بھی چپکے چپکے روتے نہیں رہتے۔۔؟ بھوک مر جاتی ہے ہماری۔۔ہول پڑنے لگتے ہیں ہم

لوگوں کو۔۔اپنی اولاد آنکھوں سے اوجھل کی جاسکتی ہے اپنی مرضی سے۔۔؟ یہ تو ہم نے اس کی بہتری کے لئے کلیجے پر پتھر رکھ لیا تھا۔۔اب آ گیا ہے تو۔۔مہینوں کے سمندری سفر سے ۔۔''

بیگم کی آواز آنسوؤں سے نم ہوگئی۔خورشید عالم کی آنکھوں میں بھی پانی سا بھر آیا۔مگر اگلے لمحے وہ پیالی اٹھا کر پُرسکون سے چائے پیتے نظر آنے لگے۔

''ٹھیک کہتی ہو۔۔ہماری تو جان ہی اس میں بستی ہے۔۔ہم کیا کر سکتے ہیں۔۔مگر ایک بار اس سے پوچھ لیں کہ کہیں اس نے وہاں کسی سے شادی۔۔''

''آپ کو لگتا ہے کہ ایسا۔۔میں پوچھوں گی۔۔نہیں۔۔پہلے اپنے طریقے سے معلوم کروں گی۔۔''

''جیسے۔۔؟''

''جیسے کہ پیار سے دلار سے۔۔کوئی آپ کی طرح اعلانِ جنگ کر کے نہیں۔۔''

اگلی صبح جب ثاقب گھڑسواری کے لئے باغوں کی جانب نکل گیا تو اس کی والدہ اس کے کمرے سے دھونے والے کپڑے لینے گئی۔

مسہری پر پڑے کوٹ کی جیب سے ایک والیٹ جھانک رہا تھا جس میں اور چیزوں کے علاوہ ایک تصویر بھی نظر آئی۔اس کا حسین وجمیل لڑکا اپنے سے کچھ لمبی لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔لڑکی کے شانے اس کے کسرتی بیٹے کے شانوں سے کچھ زیادہ کشادہ تھے اور کمر تک چست، گھیرے دار گاؤن جیسے لباس میں بھی اس کی کمر کا خم نہایت مبہم نظر آتا تھا۔جیسے کسی لڑکے کی کمر ہو۔لڑکی کے ہنستے ہوئے دانتوں کے اطراف اس کے چربی سے نابلد چہرے پر دو دو لمبی کمانیں سی بنی تھیں۔سیاہ سفید تصویر میں اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی سیاہی نسبتاً کم تھی اور

ہلکے رنگ کے ترشے بالوں کے ساتھ میل کھا کر کچھ جاذبیت عطا کر رہی تھی۔

'گورا رنگ تے بلیاں اکھاں۔' بیگم خوشید نے خالص پنجابی لہجے میں گویا اپنے آپ سے کہا۔

'کیا بات نظر آ گئی میرے بیٹے کو۔۔تجھ میں۔۔مگر اس کے باپ نے بھی تو ہمیشہ حسن کا معیار اسی پیمانے سے ماپا تھا۔۔'

انہوں نے سوچا۔

'ہمیشہ کہتے میمیں گوری ہوتی ہیں بہت۔۔مگر انہوں کبھی یہ نہیں کہا کہ حسین ہوتی ہیں۔۔خیر اپنی اپنی پسند۔۔مگر یہ بیٹا میرا۔۔بالکل اچھی نہیں لگتی اس کے ساتھ۔۔گندمی سے ہیں ہم۔۔اور وہ بھی گہرے گندمی نہیں۔۔مگر نین نقش تو ان سے کہیں۔۔مطلب اس سے کہیں اچھے ہیں۔۔اچھے نین نقش وہاں بھی ہوتے ہوں گے۔۔اب اسے یہ ہی پسند آ گئی'

وہ زرا اونچی آواز میں بولنے لگیں۔

'مگر اس کے ابا تو'

بیگم خوشید کا دل زرا سا گھبرایا۔

اب تو اسے روکنا ہی ہوگا'

وہ کچھ اور اونچی آواز میں بولیں۔

'نہیں۔۔ابھی کچھ نہیں بگڑا۔۔منہ پھٹ اور صاف گو بیٹے نے کہہ دیا ہوتا کہ شادی کر لی ہے۔۔ابھی صرف پسند کیا ہوگا۔۔'

باہر سے جمال بٹ کی کلہاڑی کے لکڑیوں پر چلنے کی آواز آ رہی تھی جو بہت سویرے سے چولہے، حمام اور آتش دانوں کے لئے لکڑی کا دوسرا ڈھیر لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔اس بار سردیوں نے کچھ طوالت پکڑ لی تھی۔چالیس روز پر مشتمل سردی کے دنوں کا بڑا حصہ' چلّہء کلاں ' گزر چکا تھا اور قاعدے سے بعد کے ' چلّہء خورد ' کی سردی میں اس قدر شدت

نہیں ہونا چاہئے تھی۔مگر ایسی کوئی بات فی الحال نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹھک ٹھک۔ٹھیک ٹھاک۔ٹھک ٹھک۔

بیگم خورشید کو لکڑی چیرنے کی آواز ہمیشہ اسی طرز میں سنائی دیا کرتی تھی۔آواز کچھ دیر کے لئے بند ہوئی تو ان کے کان باہر کی طرف لگ گئے۔ جمال بٹ نے گھاس سے بنے جوتوں کے اندر بھیڑ کے اون سے کاتے گئے موٹے کپڑے کی چوڑی سی پٹیاں بنالی تھیں اور انہیں اپنے گھٹنوں تک لپیٹ رکھا تھا۔کلہاڑے کے لکڑی سے ٹکرانے کی ضرب نے بھی زمین پر کانچ کی تختی کی طرح بچھی جمی ہوئی سخت برف کا کچھ نہیں بگاڑا تھا جب کہ کل بھی جمال بٹ اسی مقام پر لکڑیاں چیرتا رہا تھا۔

بیگم خورشید کی آنکھوں میں باہر کا منظر گھوم گیا۔

کانگڑی سینکنے کے بہانے چلم سلگائے گا اب یہ۔اور پھر باورچی خانے کے پچھلے صحن کی صفائی آج بھی رہ جائے گی۔اگر یہی رفتار رہی

جمال بٹ کی تو۔کتنا خراب لگتا ہے جمی برف پر لکڑی کا چورا سا گرا ہوا۔جیسے صفائی ہی نہ ہوئی ہو۔پھر زیبا کتنی مشکل سے سمیٹ پاتی ہے لکڑی کے ڈھیر کی طرف یہ چورا۔بیگم خورشید نے ہونٹوں کو سکیڑ کر دائرہ سا بنایا اور گردن دو ایک بار نفی میں ہلائی ۔

کب اٹھائے گا اس ڈھیر کو۔اور برادے کی کوٹھری کے پیچھے کی آڑ میں چار چار کر کے تہہ در تہہ لگائے گا۔سوکھنے کے لئے ۔یہ کام چور۔اگر اور برف گری تو کہاں چیرے گا لکڑیاں پھر ۔سارے شیڈ میں بغیر چیری لکڑیاں بھری ہیں ۔برآمدہ تھوڑی تڑوانا ہے۔

بیگم خوشید نے سر جھٹکا تو کلہاڑے کی آواز پھر کانوں میں پڑنے لگی ۔اور ساتھ ہی پتھر کی ایک ایک سل سے تراشے گئے کشادہ زینے پر زیبا کے ننگے پیروں تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔یعنی کپڑے لینے زیبا اوپر آ رہی تھی۔

ٹھاک ٹھاک۔ٹھیک ٹھاک۔ٹھک ٹھک۔

باہر سے آواز سنائی دی۔

'ٹھیک ٹھاک۔سب ٹھیک ٹھاک ہے۔کچھ نہیں بگڑا۔۔'

ہر حال میں خوش رہنے کو ترجیح دینے والی بیگم خورشید خوش دلی سے مسکرائیں۔

''میں نیچے ہی لا رہی ہوں کپڑے زیبی۔تم مت آؤ۔۔''

انہوں نے پکار کر کہا کہ کون جانے پتنگ ایسی نازک اور ڈور ایسی لچکیلی زیبی، جسے اس کے ساتھ ہاتھ بٹانے والی پہاڑن بی بونے، دھان کوٹتے وقت نظر بچا کر بار بار ثاقب کی کھڑکی کی طرف دیکھتے دیکھا تھا، سچ مچ ہی ثاقب سے بات کرتی ہو اور اسے بتا دے کہ میں اس کے والیٹ میں کچھ دیکھ رہی تھی۔

یہ ثاقب میاں بھی اسی کے ہاتھوں کی لسی پسند کرتے ہیں۔کیوں بھلا۔کیا بی بونے سچ کہا تھا۔؟نہیں نہیں۔ایسا نہیں ہوگا۔خیر۔مگر ایسا ہوگا نہیں۔یہ تربیت نہیں ہے ہمارے بچوں کی۔

بیگم خورشید کے ماتھے پر ایک آدھ بل سا کھنچ آیا۔

''اچھا بی جی۔۔''

زیبا نے بھی پکار کر کہا۔اور اس کے ننگے پیروں زینہ اترنے کی تیز تیز آواز آئی۔

بیگم خوشید نے نفی میں سر ہلایا اور ماتھے سے بل یک سر غائب ہو گئے۔

'تیرے سے تو میری زیبی اچھی ہے بے چاری۔جو اس سردی میں ننگے پاؤں کام کرتی ہے میرا اتنا۔اس جمال بٹ سے کہوں گی اپنی بیٹی

کے لئے بھی بُن دے دو چھوٹے چھوٹے جوتے گھاس کی بل کھائی رسیوں سے۔پر اِسے تو جیسے سردی ہی نہیں لگتی۔پچھلے دنوں اپنے سلیپر دئے تھے اسے۔جانے کہاں پڑے ہوں گے۔'

بیگم خورشید نے زینے کی طرف نظر ڈالی اور دوا پس تصویر کی کو دیکھنے لگیں۔

زیبی سے ہی نہ بیاہ دوں اپنے بیٹے کو۔کاشتکار کی بیٹی سے۔'

یہ ایک جملہ بیگم خورشید نے ہونٹوں سے ادا نہیں کیا۔

'خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'

انہوں نے پھر اپنے آپ سے بات کی۔

'یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ بڑے بڑے مسئلے حل کئے ہیں تو نے رشیدہ بانو، اس چھوٹی سی زندگی میں۔ اللہ کے فضل سے۔ اب اس کے اباجی کو یہ بات سنا کر پریشان ہونے سے بچانے کے لئے جلدی سے نسخہ بھی سوچنا اور بتانا ہوگا۔ باپ بیٹا دونوں بچے ہیں اس گھر میں۔ ایک میں ہی بڑی ہوں۔ پیدائشی بڑی۔

نی مائیں تیری شیداں تے پیدا ہی وڈی ہوئی سی۔'

سیالکوٹ کی پنجابن بیگم خورشید ہمیشہ پنجابی میں سوچا کرتیں اور اپنے آپ سے پنجابی ہی بولتیں کہ اور کسی کے ساتھ وہ گھر میں پنجابی نہیں بولتی تھیں۔ میاں انگریزی اور اردو بولنا اور سننا پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھی پنجابی میں گنگنا ضرور لیتے۔ بس ایک آدھ مصرعہ۔ بیگم کان آواز پر لگا دیتیں کہ ذرا اور گالیں۔ مگر وہ ایسے خاموش ہو جاتے کہ صاف ظاہر ہوتا پچھتا رہے ہیں۔ لیکن مادری زبان میں سنی لوریاں اور لوک گیت ہی تو ساری عمر یاد رہتے ہیں انسان کو کتنا بھی اردو دان اور انگریز ہو جائے وہ۔ بیگم خورشید نے زیرِ لب کہا اور گنگنانے لگیں۔

'کھیڈن دے دن۔۔ چار نی مائیں۔۔ گھر بابل دے مڑ کے نئیں اونا۔۔ بسر گیا گھر بار نی مائیں۔۔ بسر گیا گھر۔۔ کھے اے۔۔ اے۔ اے ڈن دے۔۔ کھیڈن دے دن چار نی مائیں۔'

خود باپ بن جانے کے بعد ثاقب خورشید نے اپنے بیٹے کے سامنے یہ نغمہ گنگناتے اور اپنی والدہ کی باتیں کرتے ایک دن بتایا تھا کہ کیسے اباجی پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور وہ خود ولایت نہیں جا سکے تھے۔ اماں جی نے ایک بار پوچھا بھی تھا کہ کہیں وہ مجبوراً تو نہیں رک گئے باپ

کو بیمار دیکھ کر، مگر ثاقب نے نفی میں سر ہلا دیا تھا اور اپنی خالہ زاد سے شادی کر لی تھی۔

''کہ تم کو دنیا میں آنا تھا۔۔'' وہ محبت سے بیٹے کے چہرے کو نہارتے اور اسے مظبوط بازوؤں میں اٹھا کر گھما دیتے۔ پھر بڑے سُر میں گانے لگتے۔ ایسے ہی جیسے انہوں نے اماں جی سے سنا تھا۔

'کھیڈن دے دن چار۔۔نی۔۔مائیں۔۔'

خالہ زاد سے شادی کرنے کی مجبوری کا دبا دبا سا غصہ ابا جی کی موت کے بعد بیوی پر ظاہر ہونے لگا تھا اور اماں جی کے بعد اور زیادہ شدت سے کہ خرم نے بچپن میں کئی بار انہیں ماں صاحب کو یہ کہتے سنا تھا کہ اچانک سب کچھ چھوڑ کر وہ بہت جلد ولائت جا کر اس فرنگن سے شادی کر کے اسے یہاں لے آئیں گے۔

''اور ماں صاحب اس خوف سے اکثر روتی نظر آتیں۔ انہوں نے ابو کی خوشنودی میں کوئی کثر نہیں چھوڑی تھی۔ دادی جی نے بھی بتایا تھا۔

وہ آتے تو میرا رونا تک بھول کر ان کی خدمت میں لگ جاتیں۔ حالانکہ ابو میں کوئی خوبی نہ تھی۔ دادا حضور کی جائداد کا انہوں نے بیشتر حصہ فروخت کر دیا تھا اور یہ سلسلہ ان کی زندگی تک جاری رہا۔ ماں صاحب نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں شگوفہ بیگم۔۔تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔۔''

خرم دراز ہو گئے۔ شگوفہ بیگم آہ بھر کر رہ گئیں۔

''ایسا ہوا ماں صاحب کے ساتھ۔۔اور مجھے کوئی خبر ہی نہیں۔۔کتنے ضبط سے جی ہوں گی ماں صاحب۔۔''

شگوفہ بیگم نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ ہر خوشی ان کے قدموں میں ڈال دوں۔۔''

''ہاں یہ ان کا حق بھی بنتا ہے۔۔مگر ابھی اللہ نے دو سال قبل حج کی سعادت عطا کی ہے

نا۔۔''

''جانتی ہو۔۔اُس بارگاہ سے کسی کا جی نہیں بھرتا شگوفہ۔۔خدا بہتر جانتا ہے جب سے آیا ہوں وہی منظر آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔۔آنکھیں بھر آتی ہیں۔۔دل تڑپ تڑپ اٹھتا ہے کہ ایک بار پھر کسی طرح۔۔کسی طرح ایک بار جا کر۔۔جان وہیں نکل جائے میری۔۔سچ شگوفہ یہ تجربہ ایسا روحانی سفر ہے کہ دنیا کے معنی صفر ہو جاتے ہیں۔۔تم گئی ہوتیں تو یہ بات ہی نہ۔۔''

''مگر وقت۔۔حالات۔۔اور حکم بھی یہ ہی ہے کہ فرائض سے سبک دوش ہو کر۔۔اور پھر خود وہاں کی سرکار نے کہلوایا ہے کہ جنہیں اللہ نے یہ موقع نصیب کیا وہ دوسروں کو موقع دیں۔۔بار بار جانے کی جگہ ایک بار جا کر ان کا بھی خیال کریں جو کبھی نہیں گئے۔۔کبھی بھیڑ بھی اتنی ہو جاتی ہے کہ بعض لوگ کچلے بھی گئے ہیں۔۔اور کمزوری ماں صاحب کی جان۔۔یہ ثواب نہیں کہ کسی اور کو جانے کے لئے رقم دی جائے اگر ایسا ہی ہے تو ۔۔؟۔۔یا کسی غریب کی مدد کی جائے۔کسی یتیم لڑکی کے بیاہ پر خرچ کئے جائیں۔۔''

''یہ عشق حقیقی ہے جناب۔۔عشق نہیں مانتا یہ عقل کی باتیں شگوفہ بیگم۔۔''

''اور اس کے اخراجات۔۔وہ بھی تو ایک پہلو ہے سوچنے کے لئے۔۔جو بچ رہا ہے کچھ کہیں بنکوں میں۔۔نکال دیجئے اور ماں بیٹا عمرہ کر آیئے۔۔آگے کا خدا مالک ہے۔۔ہے نا؟''

''تم اس قدر پریشان نہ ہو۔۔ایسا بڑا خرچہ نہیں ہے۔۔''

''مگر کچھ ایسی رقم ہے نہیں۔۔دیکھ لیجئے نا۔۔جا کر۔۔جوائنٹ تو ہے اکاؤنٹ ہمارا۔۔زمینوں کی سالانہ انکم کا زمانہ تو چلا گیا نا۔۔کاروبار ہے نہیں ۔۔لے دے کر تنخواہ ہی تو ہے ۔۔پھر بچوں کے بڑا ہوتے اخراجات کیسے پر لگاتے ہیں یہ آپ کو بیٹی کی شادی کے بعد بھی اندازہ نہیں ہوا۔۔مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ ایسے لاپرواہ۔۔''

''ٹھیک ہے مگر۔۔ماں صاحب کے دن جئیں گی۔۔سوچتا ہوں۔۔ایک پالیسی لی تھی۔۔

قیصر کی تعلیم کے لئے۔۔ وہ میچور ہونے والی ہے۔۔اور ابھی کوئی اور ایمرجینسی نہیں ہے۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔۔ کچھ دیکھتا ہوں۔۔ یہ بھی ضروری ہے۔۔خیر تم خود کو پلیز پریشان نہ کرو۔۔ یہ سب میرا ذمہ ہے۔۔"

"آپ کا ذمہ ہے۔۔وقت پر بات سمجھتے نہیں۔۔بعد میں مہینوں بعد کہتے ہیں کہ تم ٹھیک کہتی تھیں۔۔"

"وہ تو ہے جناب۔۔"

خرم ہنسے اور اٹھ کر غسل خانے میں چلے گئے۔

خرم کے دفتر کے ایک ساتھی اور انکی بیگم جا رہے تھے۔محرم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ماں صاحب خوش خرم لوٹیں مگر کمزور ہو گئی تھیں۔

رفتہ رفتہ ماں صاحب اور کمزور ہوتی گئیں۔

ان کے روز و شب حسبِ معمول ویسے ہی رہے۔صرف بینائی کم ہو گئی تھی۔ایک آنکھ میں موتیا بند اتر آیا تھا مگر ابھی پختہ نہیں ہوا تھا کہ آپریشن کیا جائے۔گو کہ اب کچھ پہلے بھی آپریشن کیا جانے لگا تھا۔مگر ماں صاحب نے خود ہی کچھ دیر انتظار کرنا مناسب جانا۔

قیصر ولائت چلا گیا تھا۔اور کچھ خوش نہیں تھا۔

"یہاں کے لوگوں کو اپنے علاوہ کوئی دوسرا اپنے ملک میں پسند ہی نہیں ہے۔۔بہت ساروں کو تو مذہب ہی شکائت کا سبب نظر آتا تھا۔۔"

"ہاں بیٹا۔۔لیکن آپ کے کالج کی لیول میں تو ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔۔پھر آپ کوئی نوکری کرنے تھوڑی گئے ہیں۔۔دو سال کی بات ہے۔۔"

"ہر جگہ ایسا ہی ہے مام۔۔کہیں کم کہیں زیادہ۔۔میں خوش نہیں ہوں یہاں۔۔"

قیصر کی بجھی ہوئی آواز آئی تو شگوفہ کے دل کا شگوفہ یکلخت مرجھا گیا۔ وہ خود ضبط کیے بیٹھی تھی کہ قیصر کے جانے کے بعد گھر میں صرف ماں صاحب کے کراہنے کی آوازیں آتیں۔۔ کوئی قہقہہ کم کم ہی کانوں میں پڑتا۔ خرم بھی خاموش سے ہو گئے تھے۔ اور شگوفہ پر چڑچڑے پن کا الزام تھا۔

''جہاں یہ مہینے گزرے۔۔ یہ بھی گزر جائیں گے میری جان۔۔ یہ ڈگری تمہارے بہت کام آئے گی یہاں۔۔ بس تم وہاں مت رہ جانا دوسروں کی طرح۔۔ نہیں تو مر ہی جاؤں گی میں بیٹا۔۔''

''نہیں مام سوال ہی نہیں۔۔ میں کسی سہولت کے لئے اپنے وقار سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔۔ دادی جان کہتی ہیں نا۔۔''

''ہاں بیٹا انہوں نے ہی تمہارے اس خواب کی تعبیر یہ نکالی تھی نا کہ تم بہت اونچی تعلیم حاصل کرو گے اور بڑے عہدے پر فائز ہو گے۔۔''

''ہاں۔۔ وہ جب میں نے ایک دن صبح اٹھ کر انہیں خواب سنایا تھا۔۔ جب میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں ایک ہرے بھرے باغ سے گزر رہا ہوں جس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے پودوں کی قطاریں ہیں اور ان پودوں پر زرد رنگ پھول کھلے ہیں اور سارا ماحول خوشبو سے بھرا ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ تم نے زعفران کے کھیت دیکھے ہیں اور اتنی اچھی تعبیر نکالی تھی۔۔ ہے نا مام۔۔''

''ہاں بیٹا۔۔ تمہیں یاد بھی کرتی ہیں وہ۔۔ کبھی تمہارا نام لے کر بلاتی ہیں اور پھر کسی اور کو بلانے لگاتی ہیں۔۔''

''آئی مِس ہر ٹو۔۔ مگر میں اداس ہو جاتا ہوں۔۔ جی کرتا ہے بھاگ کر آ جاؤں۔۔۔''

''نہیں بیٹا۔۔ ایسا مت کہنا۔۔''

''نہیں ماما۔۔ ڈونٹ وری۔۔ ابھی نہیں آؤں گا۔۔ بس اگلی چھٹیوں میں۔۔ یعنی چھ مہینے

بعد۔۔یعنی پچاس بار شیمپو کرنے کے بعد۔۔ہے
ناممام۔۔''

اس کی آواز میں ہنسی کی گونج سنائی دی تو شگوفہ بیگم کا آنکھیں بھر آئیں۔
''ہاں میرے بچے۔۔پچاس بار شیمپو کرنے کے بعد۔۔''اس نے آواز کو بھیگنے نہیں دیا۔
وہ فون کے پاس سے اٹھ کر برآمدے میں آگئی۔

نازونعم سے پلے بچے جانے کن خوابوں کے لئے یا والدین کی خوشی کے لئے وہاں ڈگریاں لینے ٹِک جاتے تھے۔قیصر کہتا تھا کہ وہ ان کی سخت جانی دیکھ کر حیران بھی ہوتا تھا اور پریشان بھی۔کبھی جان کا خطرہ،کبھی مال کا۔اور ہر وقت بے سبب بے عزت ہونے کا نفسیاتی تناؤ۔
شگوفہ برآمدے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی۔خرم آیا تو اس نے اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔

قیصر کی تعلیم زوروشور سے جاری تھی۔اس کے کھاتے میں بار بار رقم جمع کرنا ہوتی تھی۔جو دوسرے ملک کی کرنسی میں بدلنے کے بعد خاصی کم ہو جاتی تھی۔گو کہ اب ڈالر روپے کی نسبت کچھ سستا بھی ہوا تھا۔مگر پھر بھی وہ بات نہ تھی۔خرم کا عہدہ مزید اونچا ہو گیا تھا۔مگر روز روز کی مہنگائی اور عجیب عجیب اخراجات نے کسی قسم کی مثبت تبدیلی محسوس ہی نہ کرنے دی۔
اس دن دیر تک قیصر سے انٹرنیٹ سے رابطے میں بہت سی باتیں ہوئیں تھیں۔شگوفہ اسے ویب کیم میں کبھی ہاتھ دکھانے کو کہتی تو کبھی پیر کبھی سر کے پیچھے بال دیکھنا چاہتی کہ تناؤ سے اُڑ تو نہیں رہے۔اور کبھی ماتھے سے بال پیچھے کروا کر کہ پیشانی ویسی ہی ہے نا جیسے پہلے تھی۔اور خرم بھی ان سب باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔کھانے کی میز پر سب ہشاش بشاش لگ رہے تھے۔قیصر کے جانے کے بعد رفتہ رفتہ گھر کے لوگ اس کی غیر حاضری کو قبول کرنے پر

آمادہ نظر آتے تھے۔

''میرے پاس کچھ رقم ہے بیٹا۔۔تھوڑی تم مدد کردو تو۔۔میں عمرہ کرآؤں۔۔''

خرم کھانا ختم کرنے کے بعد بھی میز پر ہی بیٹھا رہتا تھا کہ جب تک ماں صاحب کھانا ختم نہ کرلیتیں۔میز سے واش بیسن کی طرف جاتی شگوفہ کے قدم پل بھر کو ٹھٹھک کر تھم گئے پھر آگے بڑھنے لگے۔مگر ٹھٹھک کر چلنے کے بعد رفتار غیر ہموار سی ہو گئی تھی۔

''ماں صاحب بھی اب۔۔''

خرم اندر آیا تو شگوفہ شب خوابی کا لباس پہن کر مسہری کے کنارے پر بیٹھی تھی۔

''ابھی تک سوئیں نہیں۔۔''

خرم نے بات کاٹی اور الماری کی جانب بڑھا۔

''آخر ماں صاحب کیوں نہیں سمجھتیں ہماری پریشانیاں۔۔کتنے تو لونز لے رکھے ہیں ہم نے بینکوں سے۔۔''

''ہم نے کہاں لئے ہیں۔۔بینک والوں نے دئے ہیں ہمیں۔۔''

''وہ تو ان کا بزنس ہے۔ہم منع بھی تو کر سکتے تھے نا۔۔خیر اب جو بھی ہے۔۔لونز تو ہیں نا۔۔اور ادا بھی کرنے ہیں۔۔باہر کتنا پیسہ بھیجنا ہوتا ہے۔۔انہیں کوئی۔۔''

''کیوں پریشان ہوتی ہو۔۔یہ معمولی باتیں ہیں۔۔ماں صاحب کوئی غیر تو ہیں نہیں۔۔ان ہی کی دعاؤں کے طفیل گھر پھل پھول رہا ہے۔۔جو ہے سب ان کا ہی تو ہے۔۔''

''وہ مگر ہماری ضروریات سے بھی تو واقف ہیں۔۔''

''تو انہوں نے ایسی کون سی بے پرواہی دکھائی ہے۔۔ایک ہی تو شوق ہے ان کا۔۔اور پھر ان کے پاس ہیں پیسے اپنے بھی۔۔میں وہ خرچ نہیں کرنا چاہتا۔۔''

''ہاں جسے وہ صرف خود پر خرچ کرنا چاہتی ہیں۔۔''

''ایسی کوئی بڑی رقم نہیں ہوگی ان کے پاس ۔۔تم بھی ۔۔اور اگر ہو بھی تو وہ سب ان کا ہے۔۔ مجھے اتنی بھی سعادت نصیب نہ ہوگی کہ جس ماں نے ہر حال میں گھر کا وقار قائم رکھا۔۔ہمیں خودداری سے جینا سکھایا۔۔کتنی خوش اسلوبی سے ذمہ داریاں نبھائیں۔۔ میں ان کے لئے اتنا سا کرلوں۔۔ ہمارے لئے کیا نہیں کیا انہوں نے۔۔''

''ہاں وہ تو ٹھیک کہتے ہیں آپ ۔۔مگر ایک ۔تھوڑا سا کنسرن ہوتا ہے اپنوں کی طرف ۔۔انہیں تو جیسے اور کچھ۔۔''

شگوفہ نے اپنی طرف والی میز کی بتی گل کردی۔

''ایسا نہیں ہے ۔۔تمہارا ردِعمل زیادہ شدید ہے ۔۔وہ بہت کنسرنڈ ہیں اپنی فیملی کے ساتھ۔۔اور کون ہے ان کا ہمارے علاوہ۔۔''

خرم بولتے بولتے غسل خانے کی طرف بڑھا تو شگوفہ کی آواز کانوں میں پڑی۔

''اچھا پھر صحت ان کی دیکھئے۔۔ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگئی ہیں۔۔نظر آتا نہیں اچھی طرح۔۔ دانت بھی جو بچے ہیں جھول رہے ہیں کیا کھائیں گی ۔۔کیسے کریں گی ۔۔ہم تو ان کے کھانے کا خاص خیال رکھتے ہیں۔۔''

''اللہ مالک ہے۔۔وہاں سب ملتا ہے۔۔پھر وہ اپنی صحت کا خیال رکھنا ہم سے بہتر جانتی ہیں۔۔''

وہ غسل خانے میں گھس گیا۔

اس بار ماں صاحب نے خود ہی محرم تلاش کرلیا۔انہیں رشتے دار تقریبات میں بڑے اہتمام سے بلاتے لے جاتے تھے۔

''نادرہ کی بیٹی اپنے شوہر کے پاس سعودیہ جارہی ہے۔۔اسی کے ساتھ جاؤں گی میں۔۔اور پھر وہ بھی ساتھ ہوگا۔۔اس کا شوہر عمرہ کے

وقت۔۔''

ماں صاحب نے ناشتے کی میز پر گویا خوشخبری سنائی۔

شگوفہ ملازم سے دوپہر کے کھانے کے لئے سمجھا رہی تھی۔

''ظفر دودھ لے آؤ ماں صاحب کے لئے۔۔پہلے۔۔''

خرم نے گردن موڑ کر کہا۔

''چھ مہینے تک رہے گی وہ وہاں۔۔'' ماں صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''کون نادرہ کی بیٹی۔۔اور آپ۔۔''شگوفہ نے مڑ کر دیکھا۔

''میں جلدی آجاؤں گی انشاللہ۔۔رمضان کے فوراً بعد۔۔''

''رمضان میں بڑی بھیڑ ہوگی وہاں ماں صاحب۔۔''شگوفہ نے پھر گردن موڑی۔

''تو میں کون سا کسی غیر کے ساتھ ہوں گی۔۔نادرہ کی بیٹی ساتھ ہوگی۔۔''

''نادرہ کی بیٹی کا نام کیا ہے ماں صاحب۔۔'' شگوفہ نے مسکرا کر پوچھا تو خرم جلدی سے بولا۔

''اس کا نام نادرہ کی بیٹی ہے۔۔''وہ زور سے ہنسا تو سب کی ہنسی میں برابر میں باورچی خانے کے اندر سے ظفر کے ہنسنے کی آواز بھی آئی۔ماں صاحب مسکرائیں۔

''سچ مچ مجھے تو پتہ ہی نہیں۔۔میری بھانجی کی نند کی بیٹی ہے۔۔وہاں سب اس کا ذکر اسی نام سے کرتے ہیں۔۔تو میں۔۔''

''فون پر پوچھتی ہوں ابھی ماں صاحب۔۔آپ فکر نہ کریں۔۔''

سفر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔حج کے بعد سے ماں صاحب اپنا طواف والا لباس ساتھ رکھا کرتیں تھیں۔کہتیں بلاوا آئے گا تو اسی میں دفن ہونا ہے مجھے۔میری وصیت ہے یہ۔

پہلا عمرہ بھی اسی میں ادا کیا۔اس دفعہ بھی یہ لباس ان کے ساتھ تھا۔

کچھ دن بعد ماں صاحب نادرہ کی بیٹی کے ساتھ خیر خیریت سے سعودیہ پہنچ گئیں۔فون ہر بات ہوئی تو خوش تھیں کہ صبح زیارت کے لئے جا رہی ہیں۔دو دن بعد بات ہوئی تو آواز میں نقاہت صاف نمایاں تھی۔

''میں۔۔جلدی آؤں گی بیٹا۔۔اگلے بدھ کی فلائٹ ہے۔۔'' ماں صاحب نے رک رک کر کہا۔

''مگر آپ۔۔خیریت سے تو ہیں نا ماں صاحب۔۔'' خرم کی تشویش بھری آواز ابھری۔

''ہاں۔۔ٹھیک ہوں میں۔۔آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔'' ماں صاحب کی آواز میں عجب یاسیت تھی۔

''پھر اتنی کمزور کیوں معلوم ہو رہی ہیں۔۔'' خرم کو خیال آیا کہ ماں صاحب اداس بھی ہیں ۔شاید اس لئے کہ اس دفعہ بھی ان کی دلی آرزو

پوری نہ ہوئی تھی کہ وہ زندہ لوٹنا نہیں چاہتی تھیں وہاں سے۔

''ٹھیک ہوں بیٹے۔۔''

''ماں صاحب بتایئے نا کیا ہوا۔۔؟'' فون کے سپیکرس آن تھے۔شگوفہ نے جلدی سے پوچھا۔

''میں۔۔میں گر گئی تھی۔۔'' ماں صاحب کی آواز میں آنسو شامل ہو گئے۔

''کب کیسے۔۔چوٹ تو۔۔کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔۔میں۔۔'' خرم کی بے قرار آواز ابھری تو دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز آئی

''نہیں فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔۔زرا سا کلائی پر زور پڑا ہے۔۔''

دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ نادرہ کی بیٹی کے شوہر ہونگے۔۔''

شگوفہ نے آہستہ سے شوہر سے کہا۔

''کوئی فریکچر تو نہیں ہے نا۔۔وہ تو درد میں بری طرح مبتلا معلوم ہوتی ہیں۔۔''

خرم نے تشویش سے پوچھا تو اس آدمی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''ارے نہیں صاحب ایسی کوئی بات نہیں۔۔ہم نے ڈاکٹر کو دکھا دیا ہے۔۔ایکسرے بھی ہو گیا ہے۔۔ٹکٹ بھی ہو گیا ہے انکا۔۔لیجئے بات کیجئے۔۔''

''کچھ نہیں بس۔۔سوجن ہے کلائی پر بہت۔۔اسی لئے درد ہو رہا ہے زیادہ۔۔نادرہ کی بیٹی نے بڑا خیال رکھا۔۔لو بات کرو۔۔''

''میں نے خود ٹکٹ بک کروایا ہے ان کا۔۔آپ بس وقت سے انہیں لینے آجائیے گا۔۔پھر تسلی سے ڈاکٹر کو دکھائیے گا۔۔اوکے۔۔؟''

''جی۔۔'' نادرہ کی بیٹی کا شوہر بولا۔

''چلئے تو پھر خدا حافظ۔۔''

''جی اچھا خدا حافظ۔۔''

ایرپورٹ پر دیکھا تو ماں صاحب آدھی رہ گئی تھیں۔اور درد کو بڑے ضبط سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔خرم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ایر لائنز کی خوبصورت وردی میں ملبوس ایک دبلا سا نوجوان ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر آدمی کو ویل چیئر پر بٹھائے اسی طرف آ رہا تھا۔خرم نے جلدی سے ماں صاحب کی جانب گردن موڑی۔۔ماں صاحب آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلنے لگی تھیں۔اس نے

لپک کر بازو تھام لیا۔اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر سی دوڑ گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی خرم نے ماں صاحب کی ایکسرے رپورٹ دیکھی ۔ ماں صاحب کی کلائی کی دو ہڈیوں میں سے بڑی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ایکسرے میں صاف نظر آتا تھا۔یعنی اس کو بھی جوڑا کٹر نہ ہو۔خرم کو پھر تشویش نے گھیر لیا۔وہ انہیں ائر پورٹ سے گھر لانے سے پہلے ہسپتال لے گیا۔وزن میں نسبتاً نہایت ہلکا، عمدہ قسم کا پلستر کروایا گیا اور درد کی گولیاں دی گئیں۔

ماں صاحب تڑپتی کراہتیں سی گھر پہنچیں۔اور دیوار کے سہارے آہستہ آہستہ چلتی سیدھا وضوع کرنے چلی گئیں۔ پھر کچھ دیر بعد کمرے سے ان کی سسکیاں باہر سنائی دینے لگی۔خرم کچھ مزید طاقت کی دواؤں کے لئے باہر گیا تھا کہ کسی مصدقہ وسیلے سے دوا آئے اور کہیں نقلی نہ ہو کہ نقلی دواؤں کا خفیہ چلن سا چل نکلا تھا۔شگوفہ ان کے دروازے تک جا کر لوٹ آئی ۔ماں صاحب بلک بلک کر رو رہی تھیں اور بزعمِ خود چھپ کر رو رہی تھیں۔ وہ ان کا بھرم توڑنا نہیں چاہتی تھی۔مگر جب تک ان کے رونے کی آواز آئی وہ بےقرار سی آس پاس ہی رہی۔

ماں صاحب کے روز و شب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔نہ عبادت میں نہ کھانے پینے کے معمول میں۔کبھی کبھار ان کی کوئی کراہ کانوں میں پڑتی کہ گلے میں لٹکے بازو کے بوجھ سے کمزور سے شانے کا جوڑ دکھنے لگتا تھا۔

پلستر اترا تو ہڈی کچھ ٹیڑھی جڑی تھی۔ہاتھ کلائی سے پیچھے کی طرف بالکل نہ جاتا تھا۔کلائی کا قدرتی خم تبدیل سا ہو گیا تھا۔انگلیوں کے اور میانی جوڑ مستقل طور پر خمیدہ رہتے تھے۔طبی اصطلاح میں اس طرح کا جوڑ کو کھانا کھانے والے کانٹے کی شکل سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔

مگر ماں صاحب کو اس کا کوئی ملال نہ تھا۔البتہ ہاتھ کی آزادانہ جنبش سے محرومی سے پریشان سی ہو جاتیں۔درد بھی رہتا تھا۔ہاتھ کو گرم نمکین پانی سے دھوتیں۔اس پر مالش کرتیں۔پھر

زرا راحت ہوتی تو مطمئین سی نظر آتیں۔خرم دیکھتا تو اداس ہو جاتا۔ ماں صاحب کے بال بکھرے بکھرے رہتے تھے۔چوٹی بنانے کے لئے دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور ماں صاحب کا ایک ہاتھ ٹھیک سے کام نہیں کرتا تھا۔خرم دفتر جاتے وقت اجازت لینے گیا تھا تو ان کے پاس سے گلِ یاسمین کی وہ مہک بھی نہیں آرہی تھی جو ان کی شخصیت کا حصہ معلوم ہوا کرتی تھی۔جس کے بارے میں ماں صاحب نے برسوں پہلے کہا تھا کہ پہلی بار خرم کے ابو نے ان کے لئے یہ عطر ایران سے لایا تھا ۔ابو کے تعلق سے ماں صاحب کی واحد مثبت یاد۔اب ان سے عطر کی شیشی نہیں کھلتی ہوگی۔خرم سوچتا۔

''ماں صاحب کے بال بکھرے دیکھتا ہوں تو دل دکھنے لگ جاتا ہے۔''اس نے شام کی چائے کے دوران برآمدے سے باہر کی طرف جاتے کہاں دیکھ کر کہا تھا۔

''وقت ہی نہیں ملتا مجھے۔۔ان کے ہمیشہ سجے سجائے بال دیکھ کر مجھے بھی برا لگتا ہے۔۔جب میں آتی ہوں اس وقت وہ مغرب میں مصروف ہوتی ہیں۔پھر عشا کی نماز تک جانماز پر ہی رہتی ہیں۔صبح فجر کے بعد سے بہت دیر تک جانماز پر ہوتی ہیں۔پھر کچھ وقت آرام کرتی ہیں ۔ادھر میرے جانے کا وقت ہوتا ہے۔ہفتے کو ہی کہیں وقت مل پاتا ہے مجھے۔جب جا کر کہیں کر پاتی ہوں یہ سب تھوڑا بہت۔۔''

''ہاں۔۔وہ تو ان کا معمول ہی رہا ہے ساری زندگی۔۔''

''الگ گلٹی فیل ہوتا رہتا ہے کہ مجھ سے کہیں کوتاہی تو نہیں ہوئی۔۔یہ ہی سوچتی رہتی ہوں۔۔''

''نہیں تم ایسے مت سوچو۔۔اپنی طرف سے تو۔۔''

''انہیں۔۔سب سے پہلے نادرہ کی بیٹی کے ساتھ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔؟''

''تو پھر کس کے ساتھ جاتیں۔۔تم بھی حد کرتی ہو شگوفہ۔۔''

''جانے کی ہی کیا ضرورت تھی خرم۔۔حج بھی کر لیا تھا۔عمرہ بھی۔۔پھر ایک اور عمرہ کیا ایسا ہی ضروری تھا۔۔بس ایک ضد سی پکڑ لیتی ہیں بچوں کی طرح۔۔''

''ضد نہیں ہے یہ۔۔بس وہاں مرنے کی دعا مانگتی ہیں۔۔اور اسی لئے لوٹ کر بہت دنوں تک اداس رہتی ہیں۔۔''

''یہ بھی تو ایک طرح کی ضد ہے۔۔خدا انہیں حیات عطا کرے۔۔کون جانتا ہے اپنا وقت۔۔کہ کب جانا ہے۔۔اور۔۔''

''چلو چھوڑو شکر ہے خیریت سے گھر تو پہنچ گئیں۔۔ورنہ۔۔''

''کیا خیریت۔۔زخمی اور اپاہج کر کے بھیجا ہے نادرہ کی بیٹی نے انہیں۔۔اور بجائے پلستر لگوانے کے ٹوٹی ہڈی لئے درد سے بلکتی ہوئی حالت میں روانہ کیا۔۔بے رحموں نے۔۔کتنا درد ہوتا ہوگا۔۔اب خود ٹھیک سے نہاتی دھوتی نہیں۔۔چڑ چڑی سی ہو گئی ہیں۔۔''

'' انہوں نے زندگی کے ہر سٹیج پر وقار سے جینا سکھایا ہے ہمیں۔۔ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ۔۔''

''کر تو رہے ہیں۔۔بس مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ بھانجی کی نند کی بیٹی کے شوہر کے سہارے گئیں اور کلائی تڑوالی۔۔''

''بس اب بھول بھی چکو یہ سب۔۔سب ٹھیک ہوگا انشا اللہ ۔۔''

''ہاں۔۔انشا اللہ۔۔''

ماں صاحب کو مٹھی بند کرنے اور کھولنے کے قابل ہونے میں سال بھر کا وقت لگ گیا۔ان کا سراپا سکڑ سا گیا تھا۔جسم کی تمام ہڈیوں کی ساخت چھوٹی ہوتی جا رہی تھی۔ان کا قد شگوفہ کے برابر ہوا کرتا تھا۔اب کم ہو گیا تھا۔

ماں صاحب پچاسی کے قریب ہو گئی تھیں۔اب ان کی غذا ذرا زیادہ ہو جاتی تو طبیعت خراب

ہونے لگتی۔ کبھی ایک چیز موافق آتی تو کبھی دوسری۔ ادھر ایک منفی بات یہ ہوئی تھی کہ جو چیز انہیں موافق آجاتی، اس کے کم پڑ جانے کی صورت میں انہیں شک گزرنے لگتا کہ گھر کا ملازم بھی کھاتا ہے اوران کی شکایت وہ وقتاً فوقتاً شگوفہ سے کرتیں۔ دو ملازم اسی سبب نوکری چھوڑ گئے تھے جن میں سے ایک ظفر بھی تھا۔ بڑی مشکل سے شگوفہ نے نئے ملازم کا انتظام کیا تھا ۔یہ باتیں خرم سے کہنے میں اورالجھن ہوتی تھی کہ تھوڑا سا تناوٗبٹ بھی جاتا پھر بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا کہ ماں صاحب اب باتیں بار بار بھولنے لگتی تھیں ۔اور اس فراموشی میں کبھی کبھی کھانا پینا بھی شامل ہو جاتا۔ شگوفہ نے پریشانی سے

سوچا۔ اس پریشانی میں دکھ کی آمیزش بھی تھی۔

اس دن شگوفہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی کہ شادی کا البم سامنے آگیا۔ ہرے لباس اور ہلکے ہلکے زیوارات میں ماں صاحب، سرخ جوڑے میں لپٹی بھاری زیوروں سے بجی شگوفہ سے کچھ کم حسین نہیں لگ رہی تھیں۔ بلکہ کسی کسی تصویر میں اس سے کم عمر اوراس سے زیادہ جاذب بھی۔

کبھی ماں صاحب بھی چھوٹی سی لڑکی ہوں گی۔ پھر بڑی ہوگئیں اور بدلتی گئیں۔ جیسے لڑکیاں بدل جاتی ہیں۔ بدل دی جاتی ہیں۔ بدلتے حالات انہیں بدل دیتے ہیں۔

شگوفہ کی نظریں تصویر میں اپنے مہندی رچے پیروں سے ہوتی ہوئی ادھ کھلے گھونگھٹ تک چلی گئیں۔ جسے ماں صاحب مہندی رچے ہاتھوں سے کھول رہی ہیں۔ شگوفہ کا چہرہ رو رو کر کچھ سوج بھی گیا ہے مگر میک اپ نہیں اترا ہے۔

کیسے بابل کا گھر چھوٹ گیا تھا اچانک۔

اسے اچانک شدت سے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ اس گھر میں اب کوئی نہیں رہتا تھا بھائی کسی

دوسرے ملک کا شہری ہو گیا تھا۔ دو چار برس میں کہیں ایک آدھ چکر لگاتا تھا۔ اس نے وہاں ایک چوکیدار رکھ چھوڑا تھا جس نے باغیچے کے کونے میں ایک کٹیا سی بنا رکھی تھی۔ اور مکان رفتہ رفتہ بوسیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سسکیاں لے کر رو دی۔ کسی پرانی فلم کا گانا شگوفہ کے ذہن میں گونج گیا۔

اب کے برس بھیج بھیا کو بابل۔۔ ساون میں لیجو بلائے۔

آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے نظریں ماں صاحب کی تصویر پر مرکوز کر دیں۔

ہونٹوں کو داہنی جانب خم دے کر مسکراتی ماں صاحب، موجود بیبیوں کی جانب فخر سے دیکھ رہی ہیں گویا کہتی ہوں دیکھو میری پسند۔ ان کی ہنستی ہوئی آنکھوں کی چمکتی پتلیوں کے اوپر کی جانب ذرا سے خم کھائے نتھنے میں جگ مگ کرتی لونگ بھی مسکرا رہی تھی۔ شگوفہ کے ذہن میں ماں صاحب کا موجودہ سراپا گھوم گیا۔ تصویر میں چہرے کے حسن کو دوبالا کرنے والی مسکراہٹ سے پیدا ہونے والی حسین قوس اب گہری جھری بن کر، جبڑے کے سکڑنے اور دانتوں سے سہارا ٹوٹ جانے کے سبب لٹکتے ہونٹوں کو اور نیچے لٹکاتی چہرے کا سب سے زیادہ غیر جاذب حصہ معلوم ہوتی تھی۔ تصویر کے مہندی رچے ہاتھوں میں اب بے شمار چھوٹی بڑی نسیں ابھر ابھر کر وقت کے اپنی رفتار سے چل کر خاموش ستم برپا کرنے کی سنگدل داستاں سنا رہی تھیں۔ تصویر میں پہنے، کلائیوں میں پھنسے جا رہے بڑے بڑے دو منقش کڑے اب وضو کے وقت ہاتھ اوپر تک دھوتے ہوئے ماں صاحب کی کہنیوں تک جا کر چپ چاپ لوٹ آتے ہیں۔ پتلیوں کی چمک برسوں پہلے کھو گئی تھی۔ بلکہ داہنی آنکھ کے اوپریشن کے بعد سے اس پتلی پر ماں صاحب کی آنکھوں کے کمزور پٹھے اپنا قابو کافی حد تک گنوا بیٹھے تھے اور صحت مند آنکھوں میں کتھک کی ہم رکاب رقاصاؤں کی طرح مشترکہ رخ پر تھرکنے والی پتلیاں، اب بھینگی ہو گئی تھیں۔ دہائیوں سے نتھنے میں پڑی مکئی کے دانے

جتنی بڑی لونگ کے بوجھ سے نیم بند سا ہو رہا نتھنا اب ان کی شناخت بن گیا تھا۔ چہرے پر رفتہ رفتہ بنتی ہوئی جھریاں اب گہرا گئی تھیں۔ ان سے پیدا ہونے والی سلوٹوں میں بھی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ رخساروں کی چربی ختم ہونے سے ڈھیلی پڑنے والی جلد نے ناک کو سہارا دینا چھوڑ دیا تھا اور ناک ہونٹوں کی طرف جھک آئی تھی۔ دانتوں کے غائب ہونے سے مسکراتے وقت ہونٹ دہانے کے اندر گم ہو جاتے تھے اور ناک اور ٹھوری کے درمیان کا فاصلہ نہ ہونے کے برابر ہو گیا تھا۔

شگوفہ نے ایک گہری سانس لی۔

ایسا ہر سن رسیدہ چہرے کے ساتھ ہوتا ہے اسی لئے بڑھاپے میں لوگوں کی شکلیں ملتی جلتی نظر آتی ہیں۔ گوکہ ماں صاحب کے صاف رنگ اور دبلے سے سراپے کے ساتھ اب بھی ایک الگ طرح کی خوبصورتی اور ایک مخصوص سا وقار جڑا تھا۔ مگر تصویر والی ماں صاحب اور اس وقت کی ماں صاحب دو الگ انسان معلوم ہوتیں تھیں۔

اس خیال کے آتے ہی شگوفہ البم سے نظریں ہٹا کر ذرا پیچھے کو جھکی کہ سنگھار میز کے آئینے کے سامنے ہو جائے مگر اسے اپنا چہرہ پورا دکھائی نہیں دیا۔

اب کے برس بھیج۔۔۔۔ ساون میں لیجو۔۔۔

وہ دوبارہ تصویروں کی طرف پلٹ آئی کہ بھاری بھرکم بدن سے اٹھ کر آئینہ دیکھنا اتنا ضروری نہ تھا اور دوسرے آئینہ دیکھنے کا خیال بھی کہیں لاشعوری طور پر ابھرا ڈوبا تھا۔

کیوں ہوتا ہے انسان بوڑھا۔

وہ تصویریں پلٹتی رہی۔

اور کیوں بڑھ جاتا ہے اس کا وزن۔

اس کے سامنے ایک اور تصویر کھل گئی جس میں وہ خرم کے ساتھ کھڑی کیمرے میں دیکھ رہی

ہے۔ زندگی سے لبریز آنکھوں میں مستقبل کی متوقع مسرتیں لئے اپنے حسن اور کھڑے رہنے کے باوقار انداز سے مکمل واقف۔

زندگی گزارنے میں ہر طرح کے ظابطوں کی پابند ماں صاحب، جبکہ بدل کر ایسی نظر آسکتی ہیں تو شگوفہ ایسے لاپرواہ لوگ کیسے لگیں گے۔

وہ پھر آئینے کی جانب جھکی۔ اس وقت بھی اسے اپنا آدھا ہی چہرہ نظر آیا۔ وہ جلدی جلدی البم پلٹنے لگی۔ ماں صاحب کی اور بھی کئی تصویریں تھیں۔ خورم کے دیو قامت والد کے ساتھ۔ چھوٹے سے خرم کے ساتھ۔ جوان خرم کے ساتھ۔ اور خود شگوفہ اور خرم کے بچوں کے ساتھ۔ ادھیڑ ہو رہے بیٹے بہو کے ساتھ ماہم کی شادی کی تصویریں۔ حج کی تصویریں اور عمرہ کی۔

ماں صاحب دھیرے دھیرے بالکل بدل گئی تھیں۔ نہیں بدلا تھا تو ان کے روز و شب کا معمول۔ باغیچے میں کچھ کام۔ مگر پہلے سے کچھ ہلکا۔

عبادت پہلے سے ہی انداز میں ہوتی۔ یعنی شگوفہ کی طرح بیٹھ کر نہیں۔ ہمیشہ کی طرح کھڑے ہو کر اور باقاعدہ رکوع میں جھکنا، دوزانو بیٹھنا بھی ویسے ہی۔ یعنی سب پہلے کی طرح۔

اب ماں صاحب بچہ سی ہو گئی تھیں۔ بچے کی طرح ناراض اور روٹھنے اور پھر مان جانے والی۔ گویا وہ ایک ضعیف بچہ ہوں۔ اور یہ بات بھی اب گھر کے سب لوگوں کے سمجھنے کی تھی۔ اب وہ جو بات کرتیں عام طور پر ان کی اپنی ہی ضرورت کی ہوا کرتی۔ خوراک، دوائی یا شکائت۔ چھوٹے بچے کی طرح۔ خرم کا مگر اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا کبھی۔ وہ اپنا فرض نبھانے میں خوش ہوتا تھا۔ خود شگوفہ اسے ان کا بزرگانہ بچپن جان کر خوش اصلوبی سے نبھانے کی کوشش کرتی۔

اس دن بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

''ماں صاحب کتنی سیلفش ہو گئی ہیں ماما۔۔''

قیصر نے ماں صاحب کا جملہ سن لیا تھا کہ وہ ابھی بچہ ہے اور انہیں اس کی ٹریننگ سے زیادہ اپنے تیسرے عمرہ کی فکر ہے۔

بھاری بدن کا داہنے بائیں جھکتا توازن سنبھالے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی شگوفہ کے پیچھے پیچھے ہفتہ بھر پہلے لوٹا قیصر بھی کمرے کے اندر داخل ہوا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے بیٹا۔۔''

شگوفہ مسہری کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

''تو پھر کیسا ہے مام۔۔ سنا نہیں ابھی کیا کہہ رہی تھیں ڈیڈ سے۔۔ اب اگر عمرہ کا پروگرام بنا تو میرا تو سال برباد ہو گیا نا۔۔ آئی نیڈ منی ماما۔۔ میں ڈیڈ پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔۔ ایک سکالر شپ تو مجھے ملے گا ہی۔۔ پوأر ڈیڈ۔۔ پہلے سے انہوں نے لونز لے رکھے ہیں۔۔ اور پھر کچھ سیونگ بھی تو چاہئے نا۔۔ ریٹائر بھی ہونے والے ہیں۔۔''

'' تم اس کی فکر مت کرو۔۔ وہ سب منصوبہ بند طریقے سے ہو رہا ہے۔۔ اور نہیں ہوگا تمہارا سال برباد انشااللہ۔۔ دوسرا وضیفہ بھی میرے ذہین بچے کو ہی ملے گا۔۔''

''مگر اب ماں صاحب کو کتنے عمرہ کرنے ہیں ماما۔۔ یہ تو کوئی حکم نہیں۔۔ یہ کیسی عبادت ہے۔۔''

''ایسا نہیں کہتے بیٹا۔۔ پھر انہوں نے کیا نہیں کیا ہم لوگوں کے لئے۔۔ وہ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔۔ ہم اپنے ہیں ان کے۔۔ کتنے دن رہتے ہیں بزرگ زندہ۔۔''

'' کتنے دن۔۔؟۔۔ اتنی ہیلدی ہیں وہ اپنی عمر کے لحاظ سے۔۔ ہر چیز میں ڈسپلنڈ۔۔ بوڑھے تو آپ اور ڈید لگتے ہیں۔۔ شی از ایبسولیوٹلی فٹ۔۔ اینڈ آئی اپریسیٹ دیٹ آف

کورس۔۔کوئن مدر کی طرح۔۔فیڈل کاسترو کی طرح۔۔وقت کو پیچھے چھوڑنے والی۔۔وہ تو اچھا ہے۔۔مگر ایسے میں تو لوگ خود گدیوں تک سے دستبردار ہو جایا کرتے ہیں چھوٹوں کی ضروریات اور خوشیوں کا خیال کر کے سب ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔۔مگر ان کے شوق ہی ختم نہیں ہوتے۔۔''

''یہ شوق نہیں ہے بیٹا۔۔وہ ایک بچے کی طرح ہو گئی ہیں۔۔''

''ہاں صرف اپنی پڑی رہتی ہے انہیں ہر وقت۔۔بالکل چینج ہو گئی ہیں۔۔آئی کانٹ بلیو کہ یہ وہ ہی ماں صاحب ہیں جو ہم سے اتنا پیار کرتی تھیں۔۔اب تو انہیں ہماری فکر ہی نہیں۔۔''

''اب بھی پیار کرتی ہیں بیٹا۔۔یہ سب بڑھتی عمر کے سبب ہے۔۔''

''خاک پیار کرتی ہیں۔۔آپ کو ان کا ایٹیٹیوڈ برا نہیں لگتا۔۔؟''

''لگتا ہے کبھی کبھی۔۔مگر پھر سوچتی ہوں کہ بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔۔اور کئے دن جئیں گی۔۔کوئی حسرت نہ رہ جائے۔۔''

''حسرت۔۔؟۔۔یہ ہر سال عمرہ کریں گی۔۔حج کو جائیں گی اور کبھی ان کی یہ حسرت پوری نہیں ہو گی۔۔کچھ jealous سی بھی ہو گئی ہیں۔۔اگر انہیں کوئی چیز نہیں چاہئے تو اس کو کریٹسائز کرتی ہیں۔۔''

قیصر نے اپنا سر جھٹکا۔شگوفہ اس کے بالوں کو دیکھ کر مسکرائی۔صحت مند بال لہرائے تھے تو ایک ایک بال ہوا میں الگ الگ اڑتا نظر آیا تھا۔

''نہیں بیٹا۔۔ایسا کچھ نہیں۔۔شی از لائک اے چائلڈ۔۔جسٹ اے چائلڈ۔۔''

''ماما۔۔آپ بچہ نہ کہئے انہیں۔۔یہ لوگ بڑے پریکٹیکل اور میٹر آف فیکٹ ہو جاتے ہیں۔۔وہاں ایک گرینڈ مدر نے اپنی پوتی کا مرڈر کروا دیا تھا پتہ ہے۔۔؟''

''ری اے لی۔۔؟''

''ہاں ماما۔۔وہ جاب کرتی تھی تو اُن کے پاس اپنے پیسے جمع رکھا کرتی تھی۔اس نے اپنی شادی کے لئے وہ پیسے ان سے مانگے تو انہوں نے نہیں دئے۔۔جھگڑا ہوا لڑکی نے دادی کو پیٹ دیا۔۔''

''ہاتھ اٹھایا دادی پر۔۔؟''

''جی ہاں۔۔اور پھر دادی نے کسی سے اس کو قتل کروا دیا۔۔''

''گڈ گاڈ۔۔مگر۔۔ایسا کیسے ممکن ہے۔۔؟''

''اِٹ اِز ٹرو مام۔۔اور پھر یہ نہیں کہ سیلف ڈیفینس میں مارا ہو۔۔جیسے لڑکی نے اٹیک کیا تو انہوں نے اپنے بچاؤ میں یہ فوری قدم اٹھا لیا ہو بے سوچے سمجھے۔۔نو۔۔شی پلینڈ اِٹ لائک اے کریمینل۔۔باقاعدہ منصوبہ بنا کر۔۔آپ سوچ سکتی ہیں۔۔؟''

''نہیں۔۔ہاں۔۔یہ تو باقاعدہ کسی مجرم کی طرح۔۔کیا پتہ لڑکی نے اس وقت کہا ہو کہ وہ اس کی جان لے لے گی۔۔جو ہاتھ اٹھا سکتی ہے۔۔جانے کیسی ہو وہ۔کیسی تربیت ہو اس کی۔۔دادی ڈر گئی ہوگی کہ اگر وہ اسے نہیں مارے گی تو لڑکی اسی کی جان لے لے گی۔۔مگر پھر بھی جان سے مارنے کا کیسے سوچ سکتا ہے کوئی۔۔اور اپنی اولاد کو ہی۔۔کیا پتہ دادی پہلے سے ہی ایسے کام کرتی ہو اور پکڑی نہ گئی ہو۔۔یا سزا کاٹ چکی ہو۔مگر اپنی پوتی۔۔''

''وہی تو ماما۔۔اس ایج میں انسان اگر اپنے دماغ اور جسم کو ایکٹو نہ رکھے تو بہت لیزی ہو جاتا ہے۔۔اور دوسروں پر ڈیپینڈنڈنٹ ہونے کی وجہ سے صرف اپنے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہے۔۔اسے بس اپنی ہی فکر ہوتی ہے۔۔اور پھر وہ دوسروں سے لاتعلق۔۔اور شدید معاملات میں اتنا خودغرض ہو جاتا ہے کہ جان تک لے سکتا ہے کسی کی۔۔''

''نہیں تم سب کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتے۔۔یہ انسان کی بچپن کی تربیت پر منحصر ہے۔۔چاہے وہ کتنا ہی بوڑھا ہو۔۔ناراض ہوگا۔۔عاق کر دے گا۔۔مگر جان صرف وہی

لے سکتا ہے جو اسی نیچر کا ہو۔۔تخت کے لئے لوگوں نے کیا قتل نہیں کروائے۔۔؟ باپ کا قتل کروادیا۔۔ بھائی کو مار ڈالا۔۔اب بھی کرسی کے لئے قتل ہوتے ہیں۔۔وہ تو الگ معاملہ ہے۔۔اور پھر وہ جرائم پیشہ ذہنیت ہوتی ہے۔۔کریمنل لوگوں کی بات تو الگ ہے۔۔''

''مگراس ایج کا انسان۔۔ایک بزرگ۔۔؟''

''کیا معلوم اُس کی نفسیاتی حالت کیا رہی ہوگی۔۔اس عمر میں ذہن کو اگر بیدار نہ رکھا جائے تو degeneration کی رفتار اور تیز ہو جاتی ہے۔۔پھراس کا بلڈ پریشر زیادہ ہو۔۔اور کوئی بیماری ہو۔۔یادداشت بھی متاثر ہوتی ہے۔۔اور لیزی ہو جانے والا آدمی اس عمر میں کچھ زیادہ بھولنے لگتا ہے۔۔کئی فیکٹرس ہو سکتے ہیں بیٹا۔۔''

''ہاں یہ بھی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔۔''

''پھر بوڑھے اور بچے ایک سے ہوتے ہیں۔۔بچوں کو بھی تو اپنی ہی پڑی ہوتی ہے۔۔ بھوک لگے تو روتے ہیں۔۔پیٹ بھرے تو ہنستے ہیں۔۔کھلونا نہ ملے تو روٹھ جاتے ہیں۔۔ مل جائے تو مان جاتے ہیں۔۔اُن کی ان اداؤں پر ہمیں پیار آتا ہے۔۔اور بوڑھوں پر غصہ۔۔جنہوں نے ہماری انہی اداؤں پر ہمیں کبھی کتنا پیار کیا ہوگا۔۔ہم یہ بھول جاتے ہیں۔۔''

اس نے قیصر کے ماتھے پر آرہے بال پیچھے کو سنوارے۔

''شکر ہے کہ اس عمر میں اپنے ہاتھ پیر استعمال کر پاتی ہیں۔۔نہیں تو سوچو ہمیں ہی کتنی پریشانی ہوتی۔۔۔ہے نا۔۔ہم اولڈ ہومز میں رکھنے والے لوگ تو ہیں نہیں۔۔''

''جی مام۔۔وہ تو ہے۔۔مگر۔۔''

''مگر کچھ نہیں بیٹا۔۔سب ٹھیک ہوگا۔۔چلو۔۔تمہاری پسند کے اچار کے لئے انہوں نے بہت سی سبزیاں منگوائی ہیں۔۔ان کے پاس بیٹھتے ہیں۔۔اوران کی ہیلپ بھی کرتے

ہیں۔۔دیکھوابھی بھی کچھ نہ کچھ کرتی ہیں۔۔کرنا چاہتی ہیں۔۔انہیں وقت دینا بھی ضروری ہے۔۔ شی شُڈ ناٹ فیل اَن وانٹڈ۔۔اٹس ویری اِمپارٹنٹ۔۔"

"اوکے مام۔۔بے چاری ماں صاحب۔۔"

قیصر دھیمے سے مسکرایا اور ماں کا بازو تھام کر کھڑا ہو گیا۔

"چلیئے۔۔"

وہ کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ خرم داخل ہوئے۔کشادہ سی پیشانی پر جو سامنے سے بال اڑنے کے سبب مزید کشادہ نظر آنے لگی تھی، کئی شکنیں ابھری ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا ڈیڈ۔۔آپ بھی پریشان ہیں۔۔ہیں نا۔۔؟"

قیصر والد کے چہرے کے طرف دیکھ کر مسکراتا ان کے قریب چلا گیا۔

"میں بھی۔۔مطلب۔۔؟۔۔کہو کہ میں ہی۔۔"

بیٹے کے اس محبت بھرے عمل سے پل بھر میں ماتھے کی شکنیں غائب سی ہو گئیں اور وہ بھی مسکرائے۔

"تم لوگوں نے تو اس وقت ان کا یہ برتاؤ دیکھا ہے نا۔میں صبح سے اپ سیٹ ہوں۔۔"

"اپ سیٹ ہونے والی کوئی بات نہیں ہوا کرتی اس عمر کے لوگوں کو لے کر۔۔یہ تو بچے ہو جاتے ہیں۔۔مگر ایسا کیا ہوا۔۔؟"

شگوفہ نے مسکرا کر کہا تو خرم بھی مسکرائے۔

""کتنی ذہین ہو گئی ہیں آپ ہماری کمپنی میں۔۔"

"کیا ہوا تھا ڈیڈ۔۔" خرم باپ کے جملے سے محضوظ ہو کر مسکرایا۔

''صبح میں اتنے اچھے موڈ میں ان کے پاس اپنا خواب سنانے گیا کہ ہمیشہ سے ہم سب ان سے ہی تعبیریں ہوچھتے ہیں کہ اچھی تعبیریں سنا کر دل خوش کر دیتی تھیں۔۔''

''تو۔۔؟''

''تو کچھ نہیں۔۔میں تو وہی یاد رکھے تھا کہ ماں صاحب کا کہنا ہے کہ کسی ہمدرد کو خواب سنانا چاہئے کہ سب سے پہلے جو تعبیر کی جاتی ہے۔۔وہی سچ ہو جاتی ہے۔۔''

''وہ تو ڈیڈا یسے ہی پیار میں کہتی ہوں گی۔۔ایسا سچ تھوڑی ہوگا۔۔''

''اب جو بھی ہو بیٹا۔۔میں نے دیکھا کہ علی الصباح کسی نے ایک روپہلی کشتی میں بہت سے سرخ سرخ سیب بھیجے ہیں۔تو میں پوچھتا ہوں کہ کس نے بھیجے ہیں۔اور وہ آدمی کہتا ہے آپ کے کسی ہمدرد نے اور چلا جاتا ہے۔میں خواب میں ہی سوچتا ہوں کہ ماں صاحب کے لئے رکھیں گے کہ اس موسم میں ابھی سیب اتنے سرخ نظر نہیں آتے۔اور جا کر کشتی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیتا ہوں۔۔جاگا تو ماں صاحب کو خواب سنایا کہ کچھ اچھی تعبیر سے کوئی امید بندھا دیں گی۔یہ اتنے سارے لونز۔۔ان بڑے بڑے خرچوں نے تھکا دیا ہے۔۔سب نبٹانے میں سال بھر لگ سکتا ہے۔۔کچھ دل کا بوجھ تو ہلکا ہوگا ماں صاحب کی باتوں سے۔۔بھلے جھوٹی تسلی ہی صحیح۔۔مگر۔۔''

''پھر کیا بولیں ڈیڈ۔۔؟''

''غور سے خواب سنا اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے نہیں۔۔بڑی سنجیدگی سے۔۔پھر بولیں کہ میرے تو دانت ہیں نہیں جو سیب کھا سکوں۔۔''

شگوفہ اور قیصر زور سے ہنسے۔

''اور آگے بولیں کہ تعبیر اس کی یہ ہی ہے کہ تم مجھے عمرہ کے لئے لے جاؤ گے۔۔اور مسکرانے لگیں۔۔آئی ونڈر۔۔وہ شفیق محبتوں سے بھری۔۔دوسروں کی خوشی کے لئے اپنی ضرورت کی قربانی پر تیار ماں صاحب کہاں چلی گئیں۔۔''

''پھر آپ نے کیا کہا ڈیڈ۔۔؟''

قیصر نے آنکھیں پھیلائیں۔

''انہوں نے کیا کہا ہوگا میں بتاتی ہوں مگر پہلے آپ لوگ یہ سمجھ لیجئے کہ ماں صاحب کہیں نہیں گئیں۔۔بس بڑھاپے نے ممتا کو کہیں دبا دیا ہے۔۔جو کبھی کبھی ابھر آتی ہے۔۔کمزور ہوتا ہوا جان و جسم ہر حال میں اپنا دفاع چاہتا ہے۔۔وہ سمجھتی ہیں کہ ان کے علاوہ سب اپنا خیال رکھ سکتے ہیں۔۔اس میں حیران ہونے والی بات کوئی نہیں۔ ڈوبنے والا پانی سے باہر آنے کے لئے اکثر اسے ہی دھکے دیتا باہر آنے کی کوشش کرتا ہے۔اسے خیال نہیں آتا کہ خود بچانے والا ہی اُس کی اس حرکت سے ڈوب سکتا ہے۔۔یا کبھی اگر انسان خطرے میں اچانک گھر جائے تو اس وقت وہ گود کا بچہ پھینک کر جان بچانا چاہتا ہے۔۔اسے کچھ سیکنڈ کے بعد ہی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بچہ کہاں ہے۔۔جب پھر وہ چلاّتا ہے کہ میرا بچہ کہاں ہے اور واپس بھاگتا ہے۔۔یہ ہی بات ایسے معاملوں پر بھی صادق آتی ہے۔۔''

''مگر پھر بھی بھئی۔۔انسان کی کچھ امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔۔اپنوں سے۔۔''

''وہ امیدیں آپ کو ایک ایسے انسان سے جس کی عمر پچاسی کے آس پاس ہو رہی ہو

،اور جو تھوڑی جسمانی اور زیادہ دماغی کثرت سے،یعنی مینٹل ورک سے نہ جزار ہے،نہیں لگانی چاہئے۔۔یہ ان کی نہیں ہماری غلطی ہے۔۔اس عمر میں انسان غیروں سے اولاد جیسی محبت کر سکتا ہے اور ناپسندیدہ اولاد سے نفرت۔۔یا پھر اس کے اچھے سلوک کی وجہ سے سب بھول بھال کر دوبارہ پہلے سی محبت۔۔ہمیں انہیں صرف اور صرف ایک معصوم بچہ سمجھ لینا چاہئے جو کبھی کبھی اپنے بچپن سے نکل آتا ہو ونہ اکثر اسی میں رہتا ہو۔۔''

''یہ بھی تم ٹھیک کہتی ہو۔۔''

اب میں بتاتی ہوں آپ نے ماں صاحب سے کیا کہا ہوگا۔۔؟ شگوفہ نے قیصر کی طرف

دیکھا۔

''اِنہوں کہا ہوگا۔۔ بہت اچھا ماں صاحب۔۔ انشااللہ۔۔ ایسا ہی ہوگا۔۔'' شگوفہ مسکرائی۔

''ایسا کہا تھا ڈیڈ۔۔؟'' قیصر ہنسا۔

''ہاں یار یہی کہا۔۔''

خرم نے گردن کاندھے کی طرف خم کی اور مسکرادیا۔ (ترنم ریاض)

چند آرا

ترنم ریاض اردو کی ابھرتی ہوئی فکشن نگار ہیں ۔انھوں نے اپنے ناول اور افسانوں کے ذریعے قارئین اور نقادوں کو چونکا دیا ہے ۔اردو فکشن کے گلستان میں ان کی آمد،آمدِ بہاراں ہے۔

مغنی تبسم (شعر و حکمت ۔۸)

جذبوں ،رشتوں ،زمینوں ،بستیوں اور محبتوں کی کہانیاں لکھنے والے ان ہاتھوں کو ایک عجیب فن اور بھی تقدیر ہوا ہے کہ ان ہاتھوں کی اُنگلیوں کے پورے اس طویل اور بسیط کائنات میں پھیلے سرخ ،زرد ،سبز ،فیروزی ،عنابی ،لاجوردی ،قرمزی اور سیاہ ،بھدے ،میلے اور چمکدار رنگوں کو نہ صرف یہ کہ چھو کر محسوس کر سکتے ہیں بلکہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے افسانوں کے حاشیے ،متن اور بین السطور تک کو ان سے مزین بھی کر سکتے ہیں ۔موسم ،ماحول اور موضوع کی ہم آہنگی کا اعجاز دیکھنا ہو تو معاصر اُردو افسانے میں ترنم ریاض سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

جذبوں کی فراوانی سے تھرتھراتی ہوئی یہ کہانیاں ایک ایسی نوعمر معصوم دوشیزہ کی طرح محسوس ہوتی ہیں جو اپنے لب کم کم وا کرتی ہے مگر اپنی گہری گہری آنکھیں کھول کر پڑھنے والے کو یکا یک دم بخود کر دیتی ہیں۔

''مجسمہ'' کی تکنیک ،''رنگ'' کا گہرا دُکھ اور ''یمبرزل'' کی محبت ۔فنا کی طرف بڑھتی محبت اُردو افسانے کو دیر تک اور دُور تک یاد آئے گی ۔''یمبرزل'' پڑھتے وقت محسوس

ہوتا ہے جیسے پورے افسانے کے پس منظر میں، دُور وادی میں بیٹھا کوئی شخص غم انگیز آواز میں نے نوازی کر رہا ہے۔

غالباً اس بات سے سب بخوبی واقف ہیں کہ اچھی نثر میں جمال وجلال کے علاوہ ایک عنصر موسیقی کا بھی ہوتا ہے۔ نثر میں یہ موسیقی کس طرح پیدا ہوتی ہے،۔ میں اس بات سے واقف نہیں لیکن ترنّم ریاض کی کہانیاں پڑھ کر میں اس حقیقت سے ضرور واقف ہو گیا ہوں کہ ترنّم ریاض نے نثر کی اس موسیقی کا

راز پالیا ہے۔

یہ کہانیاں بیک وقت مسرّت اور حیرت پیدا کرتی ہیں جوان کہانیوں میں ڈوب کر پڑھنے والے کو سرشار رکھتی ہیں۔ یہاں مسرّت کا لفظ خوشی کے معنی میں استعمال نہیں ہوا، یہ وہ اَپار آنند ہے جو خوشی اور غم سے بالا ایک ایسا جذبہ ہے جسے ربِّ سماوات نے اپنے بندوں کے لیے بہت زیادہ ارزاں نہیں کیا ہے۔

سید محمد اشرف (یمبرزل کے افسانے ۲۰۰۴)

ترنّم ریاض ہمارے عہد کی ایک اہم ادیبہ ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں انسانی رِشتوں کی پاکیزگی اور دِلی جذبات کے تقدّس کو نہایت پُر اثر اور بامعنی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ شاعرہ بھی ہیں، افسانہ نگار بھی اور ہمدردی کے ساتھ معاشرے کے مختلف مسائل پر غور و فکر کرنے والی حسّاس دِل انسان بھی۔ ''یمبرزل'' کے خوبصورت افسانوں کے مطالعے سے اُن کی شخصیت کے تینوں پہلوؤں کا ثبوت فراہم ہو جاتا ہے۔ شاعرانہ طرزِ بیاں، قصہ گوئی کی نزاکتوں کا اوراک اور کامیابی و ناکامی، خوشی و غم اور شکست و فتح کے سمندر میں تیرتے ڈوبتے کرداروں کی نفسیات اور ان کے احساسات کی عکاسی جیسے عناصر مصنفہ کی ہنرمندی، فنکاری اور انسان

دوستی کے آئینہ دار ہیں۔

ترنم ریاض کا ہر افسانہ بیانیہ طرزِ اظہار کا بہترین نمونہ ہے۔ واقعات آہستہ آہستہ کھلتے ہیں۔ پلاٹ کی تعمیر کے اس انداز کے سبب نہ صرف یہ کہ قارئین کی دلچسپی قائم رہتی ہے بلکہ تجسس بھی بڑھتا جاتا ہے۔ کیا لکھنا ہے؟ یہ تو سبھی جانتے ہیں، ترنم ریاض یہ بھی جانتی ہیں کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔ اور اگر لکھنا ضروری ہے تو کتنا لکھنا ہے، کب اور کہاں لکھنا ہے۔ بیان کی یہ خوبی اُن کے تخلیقی مزاج کا حصہ معلوم ہوتی ہے، شعوری طور پر کی گئی صناعی نہیں۔

وہ حقیقت پسندی اور رُومانیت کے امتزاج سے اپنے افسانوں میں منظرکشی اور جزئیات نگاری اس سلیقے سے کرتی ہیں کہ افسانے میں رونما ہونے والے واقعات، شفاف اور متحرک فضا کی پالکی پر سفر کرتے ہوئے اپنی آخری منزل تک پہنچتے ہیں اور اس طرح دلکش فضا آفرینی ان کے افسانوں کی ایک امتیازی خصوصیت بن جاتی ہے۔ ترنم ریاض کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار، واقعات اور مناظر سب سے پہلے قاری کے دِل پر اثر انداز ہوتے ہیں، پھر فہم و دانش سے لبریز ہو جانے والے دِل سے پھوٹتی شعاعیں اس کے ذہن کو بھی منور کر دیتی ہیں اور وہ خود کو افسانے کا ایک کردار سمجھ کر افسانہ نگار کے تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ فن کی معراج ہے۔ اس کسوٹی پر ترنم ریاض کے افسانے پورے اترتے ہیں۔

طارق چھتاری (یمبرزل کے افسانے ۲۰۰۴)

ترنم ریاض ایک Sweet Temper افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں میں سوز [illegible] لے اور سرمستی ہے۔ تصوف کا ایک طیف ہے جو ان کے تخیل پر محیط ہے۔ رابعہ بصری کی طرح ان کی کہانیوں میں [illegible] عظمت [illegible] اور ممتا ہے۔ وہ عورت اور مرد کے خانے میں تقسیم [illegible]

ہوتی ہے جس کے جذباتی ارتعاشات کو ہم ان کی کہانیوں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ ترنم ریاض عالمی حالات و واقعات سے مکمل طور سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی کائنات اور حیات کے مسائل کو انسانی نظر سے دیکھتی ہیں۔ ان کے یہاں جوششِ باراں نہیں ہے اور نہ ہی تمرد و طغیانی و آشفتہ جولانی بلکہ تحمل، تدبر اور تفکر ہے۔ ان کا ردِ عمل کسی بھی سطح پر ہیجانی یا جذباتی نہیں ہوتا بلکہ نہایت مثبت ہوتا ہے۔ وہ عورت مرد کے تعلقات اور دونوں کے مابین رشتوں کے رموز سے واقف ہیں اور اپنے متعینہ حدود و حریم میں رہ کر مسائل پر غور و فکر کرتی ہیں۔ درد و کرب کے باوجود آتش فشاں نہیں بنتیں بلکہ نہایت قرینے اور خوش سلیقگی کے ساتھ اپنے غم و غصے، خفگی، برہمی کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کی تخلیق سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایسی عورت کی ہے جس کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پانی سے لبالب پیالہ ہے۔ ان کی کہانیوں میں خدا کی رحیمی کے اسرار نظر آتے ہیں۔ ان کی کہانی آہستہ رو آب اور سبک خرام پانی کی طرح استقامت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ کہانی میں نہ کوئی شور و غوغا ہے، نہ مصنوعی فضا آفرینی۔ فطری فضا میں ان کی کہانی اتمام کی منزل تک پہنچتی ہے۔ وہ کہانی میں اپنا فلسفہ، اپنا ادراک، اپنا وژن نہیں بگھارتیں۔

حقانی القاسمی (ترنم ریاض بحیثیتِ افسانہ نگار ۲۰۰۳) uvu
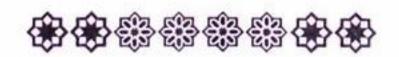
Faraeb e Khitta e Gul

Four Novellas

Tarannum Riyaz

......ترنم ریاض کی سب سے پہلی چیز جو قاری کو متوجہ اور متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ وہ افسانہ نگاری کی روایت سے منسلک ہونے کے باوجود افسانے کو اپنے داخلی اقتضا کے تحت ایک انفرادی شکل وصورت عطا کرنے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ وہ افسانہ نگاری کی مستعملہ اور مروجہ تکنیک کی رو سے افسانے کو فریم بند نہیں کرتیں جیسا کہ ان کے اکثر معاصرین (جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں) کرتے ہیں، وہ اس لمحے کی منتظر رہتی ہیں جب ان کی شخصیت کی داخلی گہرائی سے افسانہ صعود کرتا ہے اور مصنفہ بیان کنندہ کی صورت میں افسانے کو ابتدا سے آخر تک follow کرتی ہیں یہ زبان، اظہار اور ترسیل کا ایک مربوط جداگانہ عمل ہے جو میکانکی طور پر افسانہ گری نہیں کرتا بلکہ افسانے کو متشکل ہونے اور grow کرنے دیتا ہے

اس طرح سے مروجہ افسانے کے اجزائے ترکیبی یعنی ابتدا، انتہا، کردار اور پلاٹ کی تقلید نہیں کرتا بلکہ افسانہ خود اپنی ولادت اور بالیدگی کے ساتھ ہی اپنی صورت کو متشکل ہونے دیتا ہے۔ یہ شکل وصورت واقعہ اور کردار کے باہمی عمل کے ساتھ ساتھ بیان کنندہ کی فعالیت، تداخل، اور حسیت کی ہم آمیزی سے سامنے آتی ہے، بیان کنندہ صرف افسانے کے واقعات اور کرداروں کی مطابقت اور عدم مطابقت سے ہی ترسیلیت نگاری تک محدود نہیں رہتا، نہ ہی یہ افسانے کے پورے دیدنی ڈرامائی عمل میں ناظر یا شاہد، بنکر سامنے آتا ہے بلکہ آتش نفسی سے افسانے کے رگ وریشے کو زندگی کی حرارت سے آشنا کراتا ہے اور لاتعلقانہ انداز سے افسانے کو من مانے طریقے سے واقعات کی کھتونی بنا کر پیش نہیں ہونے دیتا ہے، یہ عمل دیکھکر اس تنقیدی نکتے کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہر فن پارہ اپنی ہیئت خود لے کر آتا ہے۔

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف

ترنم ریاض کے افسانوں میں زندگی کے گوناگوں مسائل و واردات کی تخیلی بازیافت ملتی ہے، یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ ان کے افسانے ایک فرضی دنیا کو خلق کرکے اس کی اوٹ میں حقیقی زندگی کی بصیرت [illegible] کرتے ہیں۔ جس فراوانی (profusion) علم وخبر اور کرداروں کے نفس الامر کیف وکم اور [illegible] پیچ وخم سے افسانے کی افسانوی شناخت ممکن ہو جاتی ہے، افسانہ استعجاب اور اعتباریت کو جنم دیتا ہے اور یہی استعجاب اور اعتباریت افسانے کے اپنے وجود کے انکشاف کو ممکن بناتا ہے۔........

حامدی کاشمیری

EXXON Press SGR. #2477370, 2477376